اردو لسانیات

ڈاکٹر شوکت سبزواری

ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

اردو لسانیات

ڈاکٹر شوکت سبزواری

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

اڈیشن ——— ۱۹۹۰ء
قیمت ——— -/۱۵
مطبع ——— عامر آفسٹ پرنٹرس دہلی
کتابت : ریاض احمد مرزا غالب روڈ الہ آباد

ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڈھ ۲۰۲۰۰۲
یو۔پی۔ بھارت

فہرست مضامین

دیباچہ ــــــــــــــــــــ ۵
اردو کی اصل اور اس کی ابتدا ــــــــــــــ ۷
اردو زبان کا ارتقا ــــــــــــــــ ۱۵
اردو کی ساخت اور اس کی سرشت ــــــــــ ۲۵
نظامِ اصوات و علامات ــــــــــــــ ۳۴
اردو صوتیے ــــــــــــــــــ ۵۲
اعرابی نظام ــــــــــــــــــ ۵۹
ہائیہ آوازیں ــــــــــــــــ ۶۶
غنہ آوازیں ــــــــــــــــ ۷۵
روزمرہ اور محاورہ ــــــــــــــ ۸۲
ترادفی مرکبات ــــــــــــــــ ۹۷
دخیل الفاظ ــــــــــــــــــ ۱۰۱
ہائے نسبت اردو میں ــــــــــــ ۱۰۶
کلمہ "ایسا" کے بارے میں ــــــــــ ۱۰۹
لسانیاتی اصطلاحات ـــــــــــــ ۱۱۵
فرہنگ اصطلاحات ـــــــــــ ۱۲۱ تا ۱۲۸

حرفِ حکایت

لسانیات کی دو بڑی شاخیں ہیں، توضیحی (یا تشریحی) لسانیات اور تاریخی لسانیات۔ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی زبان کو محض پہچاننے کے لئے توضیحی لسانیات سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن زبان کا محض پہچاننا چنداں مفید نہیں۔ اس کا جاننا یا یوں کہئے ناقدانہ جاننا بھی ضروری ہے۔ زبان کی "جان پہچان" زبان کا علم و عرفان ہے اور یہ علم و عرفان اس وقت حاصل ہوتا ہے جب زبان کے بارے میں یہ جاننے کے ساتھ کہ وہ کیا ہے اس امر کی معرفت بھی حاصل ہو جائے کہ کیوں ہے۔ کیا اور کیوں دونوں اس باب میں گویا لازم و ملزوم ہیں۔ توضیحی لسانیات، جسے آج کل خصوصیت کے ساتھ امریکا میں بہت زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے، کسی زبان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاتی کہ وہ زبان کیا ہے۔ "کیوں" اس کے دائرۂ اختیار و اقتدار سے باہر ہے۔ اس کا علم تاریخی لسانیات سے ہوگا۔ اس اعتبار سے اردو لسانیات کا منصب یہ ہونا چاہئے کہ وہ یہ بھی بتائے کہ اردو کیا ہے اور کیوں؟

"اردو لسانیات" کے ابتدائی ابواب تین توسیعی خطبات پر مشتمل ہیں جو پشاور یونیورسٹی کی دعوت پر اس کے شعبۂ اردو میں دیئے گئے تھے۔ ان ابواب میں بتایا گیا ہے کہ اردو کیا ہے۔ کب پیدا ہوئی اور ارتقا کے کن کن دوروں سے گذری۔ بعد کے ابواب اردو کی بنیادی خصوصیات کا تنقیدی اور تاریخی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ مجھے یہ بدگمانی ہے کہ ان میں اردو کے قریب قریب تمام اہم صوتی، صرفی اور نحوی عناصر و رجحانات مختصر طور پر زیر بحث آ گئے ہیں۔ لسانیات ایک وسیع اور پہناور مضمون ہے۔ اس کے تمام شعبوں کا احاطہ ایک مختصر بحث میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے دفتر بے پایاں چاہیئے جس کی فرصت بالفرض میں نکال بھی لوں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ قارئین کرام بھی طول کلام کے متحمل ہوں گے۔ اس لئے ان مباحث میں ابتدا ہی سے میں انتخابی اصول پر عامل رہا ہوں اور جو لسانی مسائل کسی نہ کسی لحاظ سے میری نظر میں اہمیت یا افادیت کے حامل تھے ان پر وقتاً فوقتاً اظہار خیال کرتا رہا ہوں۔

لسانیات کا رسم تحریر سے بھی بہ چھپتا ہوا تعلق ہے، اس لئے "اردو لسانیات" میں اردو کی

بعض اصوات کے پہلو بہ پہلو ان کی اشکال و علامات بھی زیر بحث آگئی ہیں۔ اردو صوتیوں پر، شاید اس لئے کہ علم اصوات نہیں بلکہ صوتیات بالکل جدید فن ہے، بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس فن کی روشنی میں اردو کی ملتی جلتی یعنی متشابہ آوازوں پر بھی ایک خاصی طویل بحث اس میں شامل کر دی گئی ہے۔

علم و فن کی استواری، اصطلاحات میں یکسانی و ہمواری کی محتاج ہے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض دوسرے جدید علوم و فنون کی طرح لسانیات اور جدید صوتیات کی اصطلاحات میں بھی یگ گونہ ناہمواری برتی جا رہی ہے اور بعض ایسی اصطلاحات جو پہلے سے اردو یا عربی میں رائج تھیں نئی نامناسب اور ساخت کے لحاظ سے غلط یا بھونڈی اصطلاحات گھڑی جا رہی ہیں۔ کتاب کے آخر میں لسانیات کی اصطلاحات کی ایک فہرست اور ان کے اردو ترجمے میں نے اس خیال سے درج کر دیئے ہیں کہ اہل علم ان پر غور کر کے ان کے ترک و اختیار کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں۔ شروع میں وہ اصول بھی بیان کر دیئے گئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر یہ ترجمے کئے گئے تھے۔ اصطلاحات کے ترجموں پر اہل علم کا اتفاق ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔ اردو زبان اور اردو لسانیات کے لئے یہ ایک نیک فال ہوگی۔

——— شوکت سبزواری

اردو کی اصل اور اس کی ابتدا

زبانیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ قدیم یا اصلی۔ یہ وہ زبانیں ہیں جنھیں ہم ام الالسنہ یعنی زبانوں کی اصل یا سرچشمہ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کی ابتدا بھی ہو سکتی ہے، گروہ بندی کر کے ان کے خاندان بھی بنائے جا سکتے ہیں، لیکن کسی قدیم تر یا ہمسر مخصوص متعین جانی پہچانی زبان کو ان کا ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سنسکرت، لاطینی، یونانی، قدیم فارسی وغیرہ آریائی، عربی، عبرانی، سریانی اشوری وغیرہ۔ سامی، تامل، تلگو، کنڑی وغیرہ دراوڑ خاندان کی زبانیں سب اسی قسم میں شامل ہیں۔ دوسری قسم ان زبانوں کی ہے جو کسی قدیم زبان سے ماخوذ اور ان سے متفرع ہونے کی وجہ سے جدید فرعی یا غیر اصلی کہلاتی ہیں۔ ان زبانوں کی اصل کے بارے میں بھی سوال کیا جا سکتا ہے اور ابتدا کے بارے میں بھی۔ یہ زبانیں کسی قدیم اصلی زبان کی کوکھ سے پیدا ہوئیں، جس طرح گھنے چھتنار درخت کے موٹے تنے سے چھوٹی بڑی شاخیں نکلتی ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر ایک جستجو کرنے والے کے دل میں خلش ہوتی ہے کہ معلوم کرے :۔

۱۔ ان زبانوں کا ماخذ، منبع، سرچشمہ یا اصل قدیم جانی پہچانی زبانوں میں سے کون سی زبان ہے ؟

۲۔ یہ زبانیں کس زمانے میں اپنی اصلی زبان سے بچھڑیں اور کب انھوں نے اصلی زبان سے مختلف یا موجودہ امتیازی خط و خال اختیار کیے ؟

اردو، جسے ہندی اور ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، جدید فرعی یا غیر اصلی زبان ہے۔ اس کی اصل اور ابتدا دونوں سے بحث ہونی چاہیے لیکن اردو کی اصل پر بحث کرنے سے پہلے ایک لسانیاتی اصول کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ اصول جدید لسانیات کے مسلمات میں سے ہے۔ لسانیات کی

متداول کتابوں میں اسے دلائل و شواہد سے ثابت کر دیا گیا ہے، اس لئے میں صرف اس کی وضاحت پر اکتفا کروں گا۔ وہ اصول یہ ہے کہ زبان کے سرمایہ الفاظ و اصول و اصوات میں سے صرف اصوات و اصول اس قابل ہیں کہ زبان کے ماخذ کے سلسلے میں زیر بحث آئیں۔ کسی زبان کا ماخذ دریافت کرنا ہو تو زبان کے عام ڈھلے ڈھلائے مفرد یا مرکب الفاظ مانعہ کو، جو زبان کے ڈھانچے یا کینڈے کے لئے اوپر سے منڈھی ہوئی کھال یا جھلی کی سی حیثیت رکھتے ہیں، نظر انداز کر کے الفاظ عامہ، بنیادی آوازوں (مادوں) اور صرفی نحوی قواعد و اصول کو دیکھنا چاہئے کہ کس زبان کے ہیں اور آس پاس کی کس قدیم اصلی زبان کے بنیادی سرمایہ سے ماخوذ ہیں۔

مانعہ اور مطلقہ الفاظ کی دو قسمیں ہیں۔ الفاظ مطلقہ کو الفاظ عامہ بھی کہتے ہیں۔ خاص خاص معانی دینے والے الفاظ مانعہ ہیں۔ جیسے گھوڑا، گاڑی، پلنگ، بچہ، اچھا، محبت، عداوت وغیرہ اور وہ الفاظ جو کسی خاص مفہوم و معنی کے لئے وضع نہیں ہوئے، ہر موجود پر بطریق تبادل ان کا اطلاق ہو سکتا ہے، الفاظ مطلقہ یا الفاظ عامہ ہیں۔ جیسے یہ، وہ، جو، کیا، کیوں، جب، تب، کب وغیرہ۔ سنسکرت گرامر میں انھیں سَروَ نام (سرو = سب) کہتے ہیں اور عربی گرامر میں مبہمات۔ ان کی حسب ذیل چھ قسمیں ہیں :-

۱۔ ضمیریں (پُرش واچک) وہ، تم، تو وغیرہ۔

۲۔ اعداد (سنکھیا واچک) ایک، دو، تین وغیرہ۔

۳۔ ظروف (ستھان واچک) جب، کب، تب۔

۴۔ اسمار اشارہ (درشک) یہ، وہ، اس۔

۵۔ اسمار موصولہ (سمبندھی) جو۔

۶۔ حروف استفہام (پرشن واچک) کیا، کیوں۔

ان میں سے الفاظ مانعہ میں عام طور سے لین دین ہو جاتا ہے۔ تجارتی سامان کی طرح اس زبان کے الفاظ اس زبان میں اور اس زبان کے الفاظ اس زبان میں چلے آتے ہیں اس لئے یہ الفاظ زبان کا بنیادی سرمایہ نہیں سمجھے جاتے۔ زبان کے ماخذ کے سلسلے میں خاص طور سے ان الفاظ کو جو کسی دوسری زبان سے درآمد ہوئے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ تت سم ہوں کہ تدبھو یعنی اصل شکل میں درآمد ہوئے ہوں یا بدلی ہوئی شکل میں۔ ذخیرہ الفاظ میں سے صرف الفاظ عامہ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ وہ زبان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں یا بنیادی آوازوں یعنی مادوں اور صرفی و نحوی قاعدوں کو جو

زبان کا ڈھانچا، کالبد یا پیکر ہیں۔ مثلاً اردو ہی کو لیجیے۔ اس کے سرمایہ زبان میں عربی زبان کے الفاظ بھی ہیں اور فارسی، ترکی، پرتگالی، تلیگو، گجراتی، فرانسیسی کے الفاظ بھی۔ عربی سامی خاندان کی زبان ہے۔ فارسی کا تعلق ہند ایرانی سے ہے۔ ترکی تورانی قبیلے کی ہے۔ تلیگو دراوڑ ہے، انگریزی تیوتانی ہے، فرانسیسی اور پرتگالی لاطینی ہیں۔ اگر اردو کے ان الفاظ کو بنیاد بنا کر اصلیت کا کھوج لگائیں تو اردو کس خاندان کی ہوگی اور مذکورہ بالا زبانوں میں سے اس کا رشتہ کس زبان سے قائم کیا جائے گا؟

زبان کے سرمایہ الفاظ کو لے کر اردو کی اصل کا سراغ لگانا بے سود بھی ہے اور گمراہ کن بھی۔ اس سے جویائے حقیقت بھٹک سکتا ہے۔ علم و فضل کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جیسا کہ ڈاکٹر ہیورنلے اور گریرسن کے ساتھ پیش آیا۔ اول اول ان عالموں نے اردو کے بارے میں یہ رائے قائم کی کہ اس کی اصل برصغیر ہند و پاک کی کوئی خاص زبان نہیں۔ وہ کئی زبانوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر ہیورنلے نے لکھا:۔

> "اردو مقابلتہً حال کی پیداوار ہے۔ یہ دہلی کے نواح میں جو مسلم اقتدار کا مرکز اور برج، مارواڑی، پنجابی کا سنگم تھا، بارہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جلی زبان (اردو) وجود میں آئی جو صرفی نحوی اصول کی حد تک برج ہے۔ اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی و عربی۔"
>
> (گوڈین زبانوں کی گرامر، مقدمہ ص ۶)

ڈاکٹر گریرسن نے اس پر حاشیہ چڑھایا:۔

> "اردو قواعد اور فرہنگ الفاظ کے لحاظ سے مخلوط، عام اور مشترک زبان ہے۔ اس میں شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، تلیگو زبان کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اس کے صرفی نحوی قواعد نے شمالی ہند کی عام بولیوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کسی ایک مخصوص اور معین زبان سے ترقی پاکر بنی ہے۔"
>
> (کلکتہ ریویو، ج ۱، ص ۱۵۶)

۱۹۰۰ء کے قریب برصغیر کی زبانوں کا لسانیاتی جائزہ لیا گیا اور اردو کا صرفی نحوی تجزیاتی

مطالعہ ہوا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور گریرسن نے صحیح عالمانہ جذبے کے تحت اپنی غلطی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"ہندوستانی کے آغاز کے بارے میں آج تک اہل علم نے (جن میں میں خود بھی شامل ہوں) جو کچھ بھی لکھا میر امن کے دیباچہ باغ و بہار سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ میر امن کے بیان کے مطابق اردو ان مختلف لوگوں کی بولیوں کا معجون مرکب ہے جو دہلی کے بازاروں میں جمع ہو گئے تھے۔ اس غلط فہمی کو اول اول سر چارلس لایل نے ۱۸۸۰ء میں دور کیا اور اب ہندوستانی زبانوں کے تفصیلی لسانیاتی جائزے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی (اردو) بالائی دوآبہ اور مغربی روہیل کھنڈ کی (بول چال) کی زبان ہے۔ ان گھڑ اور گنوار و الفاظ و محاورات نکال کر اسے ادبی نکھار سنگھار دے دیا گیا ہے۔"

(ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ ج ۹ حصہ ۱، حاشیہ ص ۴۲)

ڈاکٹر گریرسن کے اس اعتراف کے بعد یہ امر قریب قریب طے ہو چکا ہے۔ اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں کہ اردو کی اصل برصغیر ہندو پاک کی ایک قدیم مخصوص اور متعین زبان ہے جس سے ترقی پا کر اردو وجود میں آئی۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون سی زبان ہے اور برصغیر کے کس علاقے میں بولی جاتی تھی؟

ڈاکٹر گریرسن، جولز بلاک، چٹرجی اور دوسرے ائمۂ فن اردو کے عمیق تجزیاتی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو کا ماخذ شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش ہے جو آج سے تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) سال پہلے دوآبہ گنگ و جمن کے بالائی حصے میں بولی جاتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو کے موجودہ خط و خال شورسینی، پراکرت اور مغربی اپ بھرنش سے بہت ملتے ہیں۔ اردو میں اور ان زبانوں میں غایت درجے کی بنیادی مشابہتیں ہیں۔ لیکن اردو اصوات و اصول کا ایک بہت بڑا سرمایہ ایسا ہے جو غائر تقابلی مطالعے کے بعد ان زبانوں سے یا یوں کہئے کہ ان زبانوں کے ان روپوں سے جن کا ذکر ہیم چندر اور دوسرے قواعد نویسوں نے کیا ہے، ماخوذ نظر نہیں آتا۔ میں اپنی کتاب داستان زبان اردو میں (ص ۹۹۔۹۸) تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں صرف ایک دو نکات دہراؤں گا۔

۱۔ اردو کے عام رجحان کے خلاف پنجابی کی طرح اپ بھرنش میں مخلوط حروف صحیح کا استعمال عام

تھا جیسے بھلا (بھلا)، بھگگا (بھاگا)، بجھہ (تجھ)، بجھہ (مجھ)، بپی (باپ)، اپنا (اپنا) وغیرہ۔

۲۔ مغربی اپ بھرنش کے اسمار و صفات سندھی کی طرح عام طور سے "و" پر ختم ہوتے ہیں جیسے کنتُ (کانت)، اینٹُ (آتا)، آٹھُ (آٹھ)، گُنُ (گن)، کاسُ (کس) وغیرہ۔

۳۔ اپ بھرنش نے قدیم پراکرت 'ت' کو 'د' سے بدل لیا۔ اردو میں 'ت' برقرار رہی۔ جیسے کیلدُ (سنسکرت کریدتُ = کھیلتاہے)۔ شورسینی پراکرت میں بھی قدیم پراکرت (یا سنسکرت) کی 'ت'، پنجابی کی طرح 'د' سے بدل گئی تھی جیسے چلت (سنسکرت) چلد (پراکرت)، چلدا (پنجابی) چلتا (اردو)۔

۴۔ اردو میں فاعلی (آلی) حالت کا اظہار (نے) سے ہوتا ہے، اپ بھرنش میں ین یا ین سے جیسے دیویں یا دیوین (دیونے) "نے" ین سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔

اردو بے شبہ پراکرت سے ماخوذ ہے لیکن یہ پراکرت وہ نہیں جس کے قواعد ہیم چندر اور برصغیر کے دوسرے قواعد نویسوں نے اپنی کتابوں میں لکھے۔ میرا خیال ہے کہ اردو نے جس پراکرت سے ارتقا پایا وہ بول چال کی زبان تھی جو شورسینی، پراکرت اور مغربی اپ بھرنش سے پہلے یا ان کے پہلو بہ پہلو دوآبہ کے بالائی حصے میں بولی جاتی تھی۔ پالی، شورسینی، مغربی اپ بھرنش اس بول چال کی پراکرت کے نکھرے ہوئے ادبی روپ ہیں۔

یہ پراکرت بول چال تک محدود رہی اس لئے اس کے نمونے دستیاب نہیں ہوتے اور آج ہمیں اس کے خط و خال اجاگر کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ میں نے موجودہ اردو اور قدیم مغربی ہندی کے سرسری تقابلی مطالعے کے بعد اس کی لسانی خصوصیات متعین کرنے کی ایک ناتمام اور تشنہ سی کوشش کی ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ پراکرت جسے میں اردو کی اصل قرار دے رہا ہوں سنسکرت پالی، شورسینی پراکرت، مغربی اپ بھرنش کے سلسلۃ الذہب کی ایک گم شدہ کڑی ہے۔

اردو کی اصل متعین ہو جانے کے بعد اس سلسلے کا دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ اردو کس زمانے میں اپنی اصل سے بچھڑی اور کب اس نے اصل زبان سے مختلف یا موجودہ روپ اختیار کیا؟ یہاں پھر ہمارے سامنے ایک کڑی منزل آتی ہے اور وہ ہے اردو کی قدیم تحریری دستاویزوں کا فقدان۔ ہمیں اردو کے قدیم بے میل مستند تحریری نمونے نہیں ملتے۔ پرتھی راج راسو ہر چند قدیم تحریری دستاویز ہے لیکن بے میل نہیں۔ اس کی زبان کو خالص قدیم اردو (ہندی) نہیں کہا جا سکتا۔ امیر خسرو کی طرف جو ریختہ منسوب ہے وہ قدیم نہیں چودھویں صدی عیسوی کا ہے۔

دوسرے مستند نہیں۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ امیر خسرو کا ہے اور اگر اسے خسرو کا کلام مان بھی لیں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ دست برد سے محفوظ رہا۔ یہ کلام سفینہ کی بجائے سینہ بسینہ زبانوں پر منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اس لئے اس کا امکان ہے کہ رائج زبان اور محاورے کے مطابق اس میں حسب ضرورت ردوبدل ہوتا رہا ہو۔ اس لئے یہاں بھی ہمیں زیادہ تر قیاس سے یا کٹی پھٹی منتشر ادھر ادھر بکھری ہوئی شہادتوں سے کام لے کر فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اردو کس زمانے میں اپنی اصل سے بچھڑی۔

علماء لسانیات جنھوں نے برصغیر کی آریائی قدیم وجدید زبانوں پر تحقیقی کام کیا ہے گیارہویں صدی عیسوی کو جدید ہند آریائی زبانوں کے ابھار کا زمانہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ برصغیر ہند و پاک کی زبانوں نے اپنی اپنی اپ بھرنشوں سے ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ ابھر کر یا یوں کہئے ہیں کہ بچھڑ کر موجودہ شکل اختیار کی۔ یہی زمانہ اردو کے ابھار کا ہے۔ اردو نے بھی (اس کا نام اردو بعد میں پڑا) ۱۰۰۰ء کے بعد اپنا قدیم چولا بدلا اور آہستہ آہستہ اس کے موجودہ خط وخال نمایاں ہوئے۔ ابھی وہ پوری طرح ابھرنے بھی نہ پائی تھی اور یہ بڑے ہی جھاڑ رہی تھی کہ مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اس زبان کو نکھارا۔ ڈاکٹر بیلی ۱۱۹۳ء کو اردو کا یوم میلاد قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ۱۰۰۰ء اردو کے ابھار کا زمانہ ہے اور ۱۱۹۳ء نکھار کا۔ ۱۰۰۰ء میں اردو نے آنکھ کھولی اور ۱۱۹۳ء کے بعد نشوونما پاکر وہ اس قابل ہوئی کہ اپنی باتوں سے لوگوں کا دل بہلائے۔ اس پر تفصیل سے میں دوسرے باب میں بحث کروں گا۔ یہاں ایک دو شبہات کا ازالہ کرتا چلوں۔

یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے رشتے لسانی مشابہتوں کی بنا پر طے کئے جاتے ہیں۔ لیکن رشتے کئی قسم کے ہیں۔ ماں بیٹی کا رشتہ، خالہ بھانجی کا رشتہ، بہن بہن کا رشتہ۔ اس میں شبہ نہیں کہ دو زبانوں کی لسانی مشابہتیں یہ بتاتی ہیں کہ یہ دو زبانیں ایک دوسرے کی عزیز ہیں۔ ان میں ایک رشتہ ہے۔ کیا رشتہ ہے؟ یہ نہیں معلوم ہوتا۔ رشتہ کی نوعیت متعین کرنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ ان زبانوں کے ملتے جلتے سرمایہ میں سے جن کی بنا پر ان کے عزیز قریب ہونے کا فیصلہ کیا گیا کس زبان کا سرمایہ قدیم ہے یا ان دو زبانوں میں سے کس زبان کا سرمایہ ایسا ہے جو دوسری زبان کے سرمایہ سے ماخوذ نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی زبان کا سرمایہ دوسری زبان کے سرمایہ سے زیادہ قدیم ہے یا اس کا کچھ سرمایہ ایسا ہے جو اس کی عزیز دوسری زبان کے سرمایہ سے نہیں لیا جاسکتا تو یہ زبان دوسری زبان کی بیٹی نہیں بہن ہوگی اور یہ کہا جائے گا یہ زبانیں کسی تیسری زبان سے ترقی پاکر وجود میں آئیں۔

میں ایک دو مثالوں سے اس کی وضاحت کروں گا۔

برصغیر کی جدید بولیوں میں سے اردو برج اور پنجابی سے بہت ملتی ہے۔ ان زبانوں میں گہری لسانی مشابہتیں ہیں چنانچہ ان لسانی مشابہتوں سے فریب کھا کر ہی بعض اہل علم نے برج کو اور بعض نے پنجابی کو اردو کی اصل بتایا ہے۔ اردو میں جمع بنانے کا قاعدہ تنہا اس امر کا ثبوت ہے کہ اردو برج سے ماخوذ نہیں۔ برج میں اسم کے آخر میں "ن" بڑھا کر جمع بنائی جاتی ہے جیسے گھوڑا سے گھوڑن، سب سے سبن، برج باسی سے برج باسین وغیرہ وغیرہ۔ اردو میں مذکر کی جمع کا قاعدہ مونث کی جمع کے قاعدے سے مختلف ہے۔ فاعلی حالت میں جمع اور طرح بنتی ہے اور غیر فاعلی حالت میں اور طرح۔ مذکر میں الف پر ختم ہونے والے اسماء کی جمع فاعلی حرف صحیح پر ختم ہونے والے اسماء سے اور مونث میں 'ی' پر ختم ہونے والے الفاظ کی جمع حرف صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ سے مختلف ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

مذکر			مونث		
	فاعلی	غیر فاعلی		فاعلی	غیر فاعلی
(۱) مرد	مرد	مردوں	(۱) کرسی	کرسیاں	کرسیوں
(۲) گھوڑا	گھوڑے	گھوڑوں	(۲) عورت	عورتیں	عورتوں

اس پیچیدہ قاعدے کی موجودگی میں کیا کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس برج کو اردو کی اصل قرار دے سکتا ہے۔

اسی طرح پنجابی فعل حال "کر دا اے"، "پڑ دا اے" سے اردو فعل "کرتا ہے"، "پڑھتا ہے" زیادہ قدیم ہے۔ اس لئے کہ یہ صیغے قدیم پراکرت کے حالیہ تمام "کرت"، "پٹھت" سے لئے گئے ہیں، جن میں "ت" ہے۔ اردو نے "ت" کو برقرار رکھا پنجابی نے "د" سے بدل لیا۔ اس کے علاوہ اردو میں قدیم پراکرت پٹھ کا ہائیہ "ڑھ" کی شکل میں موجود رہا پنجابی میں وہ "ڑ" ہو گیا۔ بیس تمیس وغیرہ اعداد کا "س" پنجابی میں یہہ۔ تیہہ کی "ہ" سے اور اردو "ہے" کی "ہ" پنجابی "اے" کے الف سے، اردو "اور" کا الف پنجابی "ہور" کی "ہ" سے زیادہ قدیم ہے۔ پنجابی نے قدیم پراکرت "س" کو "ہ" سے بدلا "ہ" کو "ا" سے اور "ا" کو "ہ" سے۔ یہ لسانی شہادتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے۔

یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اردو کی ابتدا کے کیا معنی ہیں، ابتدا کو استعارے کے طور پر اہل علم پیدائش اور اس کے ابھار کو جنم دن کہتے آئے ہیں۔ اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اردو کسی

خاص زمانے میں خاص وقت پر اس طرح پیدا ہوئی جیسے بطنِ مادر سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ زبان یک بیک وجود میں نہیں آتی۔ اس میں ارتقا ہوتا ہے۔ زبان کا آغاز اس کا ارتقا ہے۔ اس کا جنم اس کے خط و خال یعنی امتیازی خصوصیات کا ابھار یا نکھار ہے۔ اس ابھار یا نکھار کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ لیکن زبان کی زندگی میں ایک دور ایسا آتا ہے جب اس کے خط و خال نمایاں ہو کر اور اس کی امتیازی خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ہم اس دور کو زبان کا یوم میلاد قرار دے سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا آغاز اس دور کے لگ بھگ ہوا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ زبان کا آغاز نہیں ارتقا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا کا سوال اس کے ارتقا سے وابستہ ہے جس پر میں آئندہ فرصت میں بحث کروں گا۔

اردو زبان کا ارتقا

زبان خلاء میں پیدا نہیں ہوتی۔ زبان کی کوکھ سے زبان جنم لیتی ہے۔ زبان کا جنم لینا کیا ہے؟ حالات و ظروف کے مطابق بدل بدلا کر اس کا نیا روپ اختیار کرنا۔ زبان برابر ادلتی بدلتی اور حالات کے مطابق نت نئے روپ دھارتی رہتی ہے۔ جب تک زبان کا بولنے والوں سے تعلق ہے یعنی زبان زبانوں پر ہے، شکست و ریخت اور ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ اس میں برابر جاری رہے گا۔ زبانوں کی خراد پر زبان ترشتی ترشاتی، چھلتی چھلاتی اور کٹ کٹا کر سڈول بنتی رہے گی۔ زبان کا بولنے والوں سے تعلق منقطع ہوا نہیں کہ جمود آیا اور ٹھٹھری۔ ردوبدل زبان کی زندگی ہے اور یہی اس کا ارتقاء ہے۔ اس لئے زبان کا ارتقاء اس کی زندگی ہے۔

اردو زندہ زبان ہے۔ زندہ زبانوں کی طرح نامعلوم زمانے سے ادلتے بدلتے، ارتقاء کی منزلیں طے کرتے، زمانے کے ناپیدا کنار بحرِ زخار کی لہروں میں بہتے ہوئے ہم تک پہنچی۔ مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے پندرہ سو (۱۵۰۰) سال پہلے کی ارتقا کی منزلیں اس نے برصغیر میں گذاریں۔ اس کی نشاندہی اہل علم نے کی ہے۔ لیکن یہ نشاندہی قیاسات پر مبنی ہے اس لئے اس پر ظن و تخمین کے کہر کا دھندلکا چھایا ہوا ہے۔

پندرہ سو سال قبل مسیح آریہ قبائل ایک زبان بولتے ہوئے برصغیر ہند و پاک میں داخل ہوئے۔ اس وقت اس زبان کا کوئی نام تھا یا نہیں، اگر تھا تو کیا؟ یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن اس علم و روشنی کے زمانے میں زبان کے کھوجی فرق و امتیاز کے لئے اس زبان کو قدیم ہند آریائی (Old Indo-Aryan) کہتے ہیں۔ قدیم اس لئے کہ برصغیر ہند و پاک میں زبان کی یہ قدیم ترین شکل ہے اور ہند آریائی اس لئے کہ یہ برصغیر کی آریائی اصل و نسل کی زبان ہے۔ اس زبان کے قدیم ترین نمونے

رگ وید میں ملتے ہیں۔

۱۰۰۰ سے ۶۰۰ ق.م کے درمیان اس قدیم زبان میں معمول کے مطابق تغیرات رونما ہوئے اور اس نے حسب ذیل تین روپ اختیار کئے:

۱۔ ادیچیہ۔ شمالی (شمال مغربی) زبان۔

۲۔ پراچیہ۔ شرقی زبان۔

۳۔ مدھیہ دیشی۔ وسطی علاقے (مشرق و مغرب کے درمیان کی) زبان۔

ان میں ادیچیہ یعنی شمال مغربی زبان کسی قدر قدامت پسند ہونے کی وجہ سے شستہ اور فصیح سمجھی گئی۔ یہ قدیم ہند آریائی سے مقابلۃً زیادہ قریب تھی۔ اودھ، بہار اور مشرقی یو۔ پی۔ کی زبان پراچیہ غیر فصیح یعنی ان گھڑ تھی کیوں کہ وہ اصل سے دور جا پڑی تھی، اس میں:

۱۔ قدیم ہند آریائی "ر" کو "ل" سے بدل کر آریہ (= دشمن) کو "الیو" کہا جاتا تھا۔

۲۔ مخلوط حروف صحیح میں ادغام عام تھا۔

۳۔ "ر" یا "ڑ" کے بعد آنے والے اسنانی حروف (ت، د)، ملفوظی (ٹ، ڈ) بنالیے گئے تھے۔

مدھیہ پردیش کی زبان بین بین تھی۔ اس میں تبدیلیاں ہوئیں لیکن مشرقی زبان کی نسبت سے کم اور غیر اہم۔ مثلاً قدیم ہند آریائی الفاظ کرت (= کیا ہوا)، ارتھ (= مطلب)، ارذھ (= آدھا) شمال مغربی علاقے میں علی حالہ باقی رہے۔ وسطی علاقے کی زبان میں "ر" حذف ہوئی اور کرت کو کت، ارتھ کو اتھ، اردھ کو ادھ کہا گیا۔ مشرق میں "ر" گری اور "ت" "د" کو بہ ترتیب "ٹ" "ڈ" سے بدلا گیا تو ان کا تلفظ کٹ، اٹھ، اڈھ ہوا۔

اردو مدھیہ دیش کی اس قدیم زبان کی آخری کڑی ہے۔ مدھیہ دیش کی اس زبان کو اردو کا قدیم ترین روپ دھارنے سے پہلے تین ارتقائی دوروں سے گذرنا پڑا۔ جن میں کا ہر دور کم و بیش ۵۰۰ سال کا ہے۔ پہلا دور ۵۰۰ ق.م سے شروع ہوکر ولادت مسیح پر ختم ہوا۔ یہ پالی یا اولین پراکرت کا دور ہے۔ دوسرا دور ۵۰۰ عیسوی پر اختتام کو پہنچا۔ اسے پراکرت دور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ عیسوی تک کا دور اپ بھرنش کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مدھیہ دیش کی ان ارتقائی کڑیوں کو شجرہ نسب کی شکل میں اس طرح بیان کریں گے۔

۱۔ قدیم ہند آریائی

ادیچیہ — ۲۔ مدھیہ دیشی — پراچیہ

۳۔ ادلین پراکرت (پالی)

۴۔ پراکرت

۵۔ اپ بھرنش

۱۰۲۷ء میں محمود غزنوی نے جب پنجاب فتح کیا اور لاہور کو شاہی معسکر یعنی فوجی چھاؤنی بنایا تو اس وقت برصغیر میں اپ بھرنش کا سکہ چل رہا تھا۔ البوریحان البیرونی (۹۷۳ء-۱۰۴۸ء) کا بیان ہے کہ ہند کی زبان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بول چال کی زبان ہے جس میں عوام بات چیت کرتے ہیں یہ کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ دوسری علمی زبان ہے۔ اس کے صرفی نحوی قاعدے ہیں، اشتقاق کے اصول ہیں۔ اس علمی زبان کا ذکر امیر خسرو (۱۲۵۳ء-۱۳۲۵ء) نے بھی کیا ہے:

زبان ہند ہم تازی مثال است — کہ آمیزش در انجا کم مجال است
گر آئین عرب نخواست وگر صرف — ازاں آئیں دریں کم نیست یک حرف

میرا خیال ہے کہ بول چال کی زبان اپ بھرنش ہے جس کے لفظی معنی ہیں پست، افتادہ گری پڑی۔ یہ علمی زبان سنسکرت کے مقابلے میں پست سمجھی جاتی تھی۔ ہیم چندر (۱۰۸۸ء-۱۱۷۲) نے اپ بھرنش کے کچھ دوہے مثالاً اپنی پراکرت گرامر میں نقل کیے ہیں۔ اگرچہ ان دوہوں کی زبان اردو کی اصل بول چال کی اپ بھرنش نہیں اس دور کی ادبی زبان ہے لیکن موجودہ اردو سے اس کی مماثلتیں یہ بتاتی ہیں کہ بارہویں صدی عیسوی میں اردو کے خط وخال ابھرنے شروع ہو گئے تھے اور زبان کا ڈول پڑ رہا تھا۔ ذیل کے دوہے کو موجودہ اردو میں منتقل کرنے سے میرے اس خیال کی وضاحت ہوگی۔

بھلا (بھلا)، ہُوآ (ہوا)، جُ (جو)، مارآ (مارا گیا)، بہن (بہن)، مہارا (میرا)، کنتُ (کانت = شوہر)، لجیم (لجا = شرم کو)، تُ (تو)، وامی اُدْ (سہیلیو)، جنی (جاتی)، بھگّا (بھاگا)، گھرو (گھر میں)، اینتُ (آتا)۔

ایک اور دوہا ملاحظہ ہو :

جئی (جو)، نَ (نہیں)، سَ (وہ)، آدَ ئی (آدے)، دوی (دوتی = پیامی)، گھرِ (گھر میں)، کا (کیوں)، آہُو (مِتا)، موہر (مہنہ)، تجھو (تیرا)۔

وان (بچن)، ج کھنڈئی (توڑ رہا ہے)، تئو (تو)، سہسے (سکھی)، سَ (وہ)، پیو (پی)، ہوئی (ہووے)، نہ مجھو (میرا)۔

ان میں بھلا، ہوآ، مارِ آ، بِھنِ، بھگا، گھرِ، جئی، آدئی، موہر، تجھو مجھو وغیرہ کلمے اور صیغے خاص طور سے غور کے قابل ہیں۔ یہ اردو کے موجودہ کلموں اور صیغوں کی قدیم شکلیں ہیں۔

اردو کے چار ارتقائی دور ہیں۔ پہلا قدیم دور ۶۰۰ ق۔م۔ پر ختم ہوا، دوسرا ۵۰۰ عیسوی پر اور تیسرا ۱۰۰۰ عیسوی پر۔ چوتھے دور کا آغاز میرے خیال میں ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ ہوا اور ۱۸۰۰ء پر اختتام پر پہنچا۔ درمیان کے دو سو سال (۱۰۰۰ء تا ۱۲۰۰ء) اردو کے لئے عبوری یا تعمیری زمانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں اردو بقول ڈاکٹر چٹرجی سیال حالت میں تھی۔ خط و خال ابھر چکے تھے لیکن اس میں صلابت استواری اور پختگی نہیں آئی تھی۔

ان چار ارتقائی دوروں کی وضاحت کے لئے اردو کے بنیادی سرمایہ میں سے دو چار لفظوں کے عہد بہ عہد تغیرات جو دراصل ان کے ارتقائی مدارج ہیں، مثال کے طور پر پیش کروں گا۔ اردو کے ظرفی لاحقہ "میں" کو لیجئے۔ قدیم ابتدائی دور میں یہ "مدھیے" تھا (مدھی + ے) جس کے معنی ہیں وسط میں یا درمیان میں۔ دوسرے دور میں "مجھے" (بہ تبدیل "دھی" بہ "جھ") ہوا۔ تیسرے دور میں اس نے مہ मह् کی شکل اختیار کی جس کا ایک روپ مَہِ मह ہے۔ یہ دونوں روپ عبوری دور میں رائج تھے۔ "میں" (مَ + ہِ ے) اس کی آخری نکھری ہوئی شکل ہے۔ "کیا" ماضی مطلق کا صیغہ واحد غائب ہے کرنا سے۔ قدیم دور میں یہ کرتہ (کیا ہوا) تھا جو "گرِ" (کرنا) سے حالیہ تمام ہے۔ دوسرے دور میں "کِتَ" (ر گرنے کے بعد) ہوا۔ تیسرے دور میں کِءَ (بحذف ت) عرصے تک اس کی شکل رائج رہی۔ ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ جب اردو نکھر کر سامنے آئی تو اردو کے عام مزاج کے مطابق اس نے کیا شکل اختیار کی۔ "ہوا" کی سرگذشت بھی وہی ہے جو "کیا" کی ہے۔ یہ اصل میں بھوت (بھو = ہونا) تھا۔ ہُوت، ہُو اس کی درمیانی کڑیاں ہیں۔ "کیا" میں "ک" کے کسرے کی وجہ سے فتحہ نے "ی" کی شکل اختیار کی "ہوا" میں "ہ" کے ضمے کی وجہ سے فتحہ نے "و" کا روپ دھارا۔

ضروری نہیں کہ زبان کے سارے سرمایہ کو چار دوروں سے گذرنا پڑے۔ بعض کلمے صرف تین

دوروں سے گذرے مثلاً 'بھلا' اور 'بہن' کی حسب ذیل تین منزلیں ہیں۔ بھدر، بھلآ، بھلا، بھگن، بہن، بہن۔

عبوری دور کی اردو کو گریرسن وغیرہ علما قدیم مغربی ہندی کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں مغربی ہندی کسی خاص جانی پہچانی زبان کا نام نہیں۔ یہ کسی علاقے کی بولی جانے والی زبان نہ تھی۔ اردو، برج، ہریانی، قنوجی، بندیلی کا مشترک لسانی سرمایہ مغربی ہندی ہے۔ یہ ایک طرح کی فرضی زبان ہے۔ چند بردائی کی مشہور نظم "پرتھی راج راسو" کی زبان کو قدیم مغربی ہندی بتایا جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ راسو کی زبان مصنوعی، خود ساختہ ممسوخ ادبی زبان ہے جس میں پنجابی، راجستھانی، برج، مغربی، اپ بھرنش گڈمڈ ہو کر آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہیں۔ برج کے عناصر اس میں دوسری ہم سر زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ قدیم اردو عناصر بھی دستیاب ہوئے ہیں لیکن ندرت کے ساتھ جیسے ذیل کے مصرعے میں اردو کا ظرفی لاحقہ "میں"۔

ایک ماس میں نگر بسایو
(ایک ماہ میں شہر بسایا)

واحد متکلم کی ضمیر "میں" اردو ہے۔ 'ہوں' برج اور پنجابی۔ راسو میں 'ہوں' بھی ہے اور 'میں' بھی جیسے:

میں سنیا ساہی بن انتّی کیں
(میں نے سنا شاہ نے اندھا کر دیا)
تج بھوگ جوگ میں تپ لیں
(کھانا پینا چھوڑ میں نے تپسیا اختیار کی)

مجھ، تجھ، ہم تم وغیرہ اردو ضمیریں بھی راسو میں ہیں۔ جیسے:

ہم تم کبھو نہ درودھ۔ ہم تم کام اہ شیت آج۔ اِہ دھرتی مجھ بت پربت۔ شروں سنا دن تجھ۔

اہل علم ان مثالوں کی قدامت سے شاید انکار کریں اور انھیں الحاقی بتائیں لیکن جان بیمز فرماتے ہیں کہ ان کا اسلوب چند بردائی کا ہے۔ قیاس کا تقاضا ہے کہ یہ مصرعے چند بردائی کے ہوں۔

بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں اردو دہلی اور اس کے نواحی علاقے یعنی میرٹھ میں بولی جارہی تھی۔ محمد غوری کے انتقال کے بعد ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ میرا خیال ہے اس سے پہلے اردو ابھر کر برج، قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز حاصل کر کے

ریختہ اور آزاد بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس امتیاز کے بعد اردو کو اہل علم نے کھڑی بولی کے نام سے یاد کیا۔ اس کی ہمسر بولیاں 'پڑی' کہلائیں۔ شیام سندر داس چودھویں اور پندرہویں صدی کے درمیانی زمانے کو کھڑی بولی کے ابھار کا زمانہ بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

"۱۳۵۰ء اور ۱۴۵۰ء کے درمیان قدیم ہندی بولیوں نے دھیرے دھیرے برج، اودھی اور کھڑی بولی کا روپ دھارا۔"

(ہندی بھاشا کا وکاس ص ۵۴)

مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرے خیال میں اردو کا ابھار بارہویں صدی میں ہوا۔ اس صدی کی اردو یعنی کھڑی بولی کے نمونے مسلسل اور مرتب صورت میں دستیاب نہیں ہوتے۔ شاید اس لئے اہل علم کو شبہ ہے کہ بارہویں صدی میں اردو اپنی موجودہ شکل میں موجودہ خط و خال کے ساتھ موجود تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ زبان کی کسی ارتقائی منزل کی تعیین و تشخیص کے لئے اس دور کے مسلسل و مرتب نمونوں کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کے بعد کے تحریری نمونوں کی بنا پر بھی اس سے پہلے کی ارتقائی منزل کے بارے میں :

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

قیاس کیا جا سکتا اور باغ کی بہار کو دیکھ کر بتایا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے کی بہار کا کیا عالم ہوگا۔ زبان پر مہینے یا سال نہیں جگ بیت جاتے ہیں تب کہیں اس کے نامختتم سفر کی کوئی منزل سامنے آتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کلیتاً درست نہیں کہ بارہویں اور تیرہویں صدی کی کھڑی بولی کے نمونے دستیاب نہیں ہوتے۔ تیرہویں صدی سے پندرہویں صدی تک کی شمالی ہند یعنی دہلی اور میرٹھ کی اردو کے نمونے ملتے ہیں لیکن خال خال اور ندرت کے ساتھ۔ بابا فرید گنج شکر (۱۲۶۶ء-۱۱۷۳ء) کا ذیل کا ریختہ مولانا محمود شیرانی نے کسی قدیم بیاض سے نقل کیا ہے۔

وقت سحر، وقت مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے

نفس مبادا کہ بگوید ترا — خپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

بادم خود ہمدم و ہشیار باش — صحبت اغیار بری بات ہے

با تن تنہا چہ روی زین زمین — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

پند شکر گنج بدل جاں شنو

ضایع مکن عمر کہ ہیہات ہے

حضرت گنج شکر کے چند کٹے پھٹے مقولے کتب تواریخ میں نقل ہوئے ہیں۔ ان سے بھی اس زمانے کی کھڑی بولی (اردو) کے خط وخال اجاگر ہوتے ہیں۔ مثلاً سید محمد بن مبارک کرمانی نے سیرالاولیار میں بابا فرید کا ایک مقولہ نقل کیا ہے۔

"مادر مومناں! پونون کا چاند بالا ہوتا ہے۔"

اس میں "کا"، "چاند"، "بالا"، "ہوتا ہے" ٹھیٹ اردو ہے۔

حضرت بابا فرید کے دو شبدوں (نظموں) کا ذکر، جو سکھوں کے آدی گرنتھ میں ہیں، ڈاکٹر چٹرجی نے کیا ہے۔ گو وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ان شبدوں کی زبان کس حد تک بے میل اور مستند ہے لیکن اس میں انھیں شبہ نہیں کہ ان کی زبان قدیم ہندی (اردو) ہے۔

چودھویں صدی میں امیر خسرو (۱۲۵۳ء - ۱۳۲۵ء) اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱ء ۱۴۲۲ء) کے تحریری نمونے سامنے آتے ہیں۔ امیر خسرو کے حسب ذیل دو شعر عام تذکرہ نویسوں نے نقل کئے ہیں۔

زرگر پسرے چو ماہ پارہ	کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست	پھر کچھ و نہ گھڑا نہ کچھو سنوارا

ذیل کا ریختہ بھی خسرو کی طرف منسوب ہے:

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو ن جو میں نہ دیکھو تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں بتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپید من کو درائے راکھوں جو جان پاؤں پیا کی گھتیاں

یہ ریختہ کھڑی بولی میں ہے گو آٹے میں نمک کی طرح اس میں برج کی آمیزش بھی ہوگئی ہے۔

خسرو نے پہیلیاں بھی کہی تھیں جن میں سے بعض صاف اردو میں ہیں۔ جیسے :

آوے تو اندھیری لاوے جاوے تو سب کچھ لے جاوے
کیا جانوں وہ کیسا ہے جیسا دیکھا ویسا ہے

ایک تھال موتی سے بھرا سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے موتی اس سے ایک نہ گرے

صاف زبان دیکھ کر ان کے مستند ہونے میں شبہ کیا جا سکتا ہے لیکن مشہور ہندی عالم ہری اودھ انھیں مستند سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

"خسرو کا نواس دلی میں تھا۔ میرا وچار ہے کہ اس کے انتر میرٹھ کے آس پاس جو بولی اس سمے بولی جاتی تھی اس پر درشٹ رکھ کر انھوں نے اپنی رچنائیں کیں اس لئے وہ ادھک تر بول چال کی بھاشا کے انوکول ہیں اور اسی سے ان میں وشیش صفائی آگئی ہے۔"

فیروز شاہ تغلق (متوفی ۱۳۸۸ء) کے ملازمہ سے متعلق ایک فقرہ تاریخ فیروز شاہی میں نقل ہوا ہے :

"برکت شیخ تھیا اک موا اک نہا"

زبان کے ارتقا کے سلسلے میں عام الفاظ سانعہ کے تاریخی تغیرات کی چنداں اہمیت نہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم فارسی لغات اور فرہنگوں میں فارسی الفاظ کے ہندی (اردو) مترادفات کا اندراج (ان کی فہرست مولانا شیرانی مرحوم کی کتاب "پنجاب میں اردو" میں دیکھی جائے) اور فارسی کتب تاریخ میں اردو الفاظ کا حسب موقع استعمال یہ بتاتا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر چٹرجی نے لکھا ہے کہ اردو اس قدیم زمانے میں آزاد بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ مشہور مراکشی سیاح ابن بطوطہ (۱۳۰۴ء - ۱۳۷۸ء) کے سفرنامے اور مغل شہنشاہ بابر (۱۴۸۳ء - ۱۵۳۰ء) کی خود نوشت سوانح میں بھی ہندی (اردو) الفاظ خاصی بڑی تعداد میں استعمال ہوئے ہیں۔ بابر کے مجموعہ کلام میں اس کا یہ شعر درج ہے جس کا پہلا مصرعہ پورا اور دوسرے مصرعے کا تین چوتھائی اردو میں ہے۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا حالنا بس بل گسدر پانی و روٹی

چودھویں صدی کے شروع میں اردو محمد تغلق کے ہم رکاب، جو دہلی سے ہجرت کر کے دکن جا بسا تھا، دکن گئی اور وہاں کی اردو سے الگ تھلگ اسے ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ ڈاکٹر بیلی کا خیال ہے کہ چودھویں صدی کے نصف تک دہلوی اور دکنی اردو میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ دونوں مقامات پر وہی ایک زبان بولی جاتی تھی۔ بہمنی حکومت کے قیام (۱۳۴۷ء) کے بعد گجراتی، مرہٹی، تلیگو وغیرہ زبانوں کے زیر اثر اردو میں تبدیلیاں شروع ہوئیں اور صدی کے ختم ہونے سے پہلے اس میں اور دہلوی اردو میں اختلافات کی ایک خاصی وسیع و عریض خلیج حائل ہو گئی۔ دہلوی اردو کے دستاویزی نمونوں کی کمیابی کی تلافی دکنی اردو سے ہو جاتی ہے۔ دکنی اردو کے (منظوم و منثور) نمونے ۱۳۵۰ء سے ۱۷۰۰ء تک مسلسل اور مرتب انداز میں ملتے ہیں۔ یہ قدیم اردو کے خط و خال کی تعیین اور زبان کے ارتقائی دوروں کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ دکنی اردو کی قدیم ترین تصنیف معراج العاشقین ہے جسے موجودہ تحقیق کے مطابق خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ نے چودھویں صدی کے آخر میں تصنیف کیا۔ خواجہ صاحب پندرہ سال کی عمر میں دکن سے دہلی چلے آئے تھے اور تقریباً ۲۳ سال دہلی میں قیام کے بعد ۱۳۹۸ء میں دکن واپس ہوئے۔ اگر معراج العاشقین درحقیقت خواجہ صاحب کی تصنیف ہے تو اس کی زبان دہلی کی قدیم زبان ہونی چاہئے۔

معراج العاشقین کے لسانی مطالعے کے بعد یہ حیرت خیز حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کی زبان مرہٹی، گجراتی، تلیگو وغیرہ زبانوں کے اثرات سے بڑی حد تک پاک ہے۔ معراج العاشقین میں "گا" بڑھا کر فعل مستقبل بنایا گیا ہے۔ تجھ، مجھ کی جگہ میرا، تیرا معیاری ضمیریں استعمال ہوئی ہیں، رکھا، دیکھا دو ماضی کے صیغے "ی" کے بغیر ملے ہیں۔ ایک مقام پر کان کی جمع کانوں دیکھی گئی ہے، بیر کی باتاں، معشوق کی باتاں، جیسی ترکیبیں بھی نظر پڑی ہیں جن میں "کی" (علامت اضافت) مضاف کی جمعیت کے باوجود مفرد ہے، ہائیوں کا استعمال بھی کثرت سے ہوا ہے۔

اس کے مقابلے میں شاہ میران جی شمس العشاق (متوفی ۱۴۹۶ء) اور ان کے صاحبزادے برہان الدین جانم (متوفی ۱۵۸۲ء) کی تحریروں میں مرہٹی، گجراتی، پنجابی، برج کے اثرات ملتے ہیں اور وجہی کی تحریروں میں راجستھانی کے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جب معراج العاشقین تصنیف ہوئی تو دکنی، دہلوی اردو سے مختلف نہ تھی اور اپنی اصل سے بچھڑے اسے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ بیلی اور شری رام شرما نے لکھا ہے، کہ اس کے مصنف خواجہ بندہ نواز

نے اپنی عمر کے ۶۵ سال دہلی میں گذارے تھے۔ اس لئے انھوں نے دہلی کی زبان میں لکھا جو اس زمانے میں دہلی کے کوچہ و بازار میں بولی جاتی تھی۔

بہرحال یہ امر شبہ سے بالاتر ہے کہ قدیم دکنی اردو کا قدیم روپ ہے۔ قدیم اردو کے جلوے دکن کی تصانیف میں دیکھے جا سکتے ہیں جن کا سلسلہ تیرہویں صدی سے شروع ہوا اور جن کے قدیم مخطوطے آئے دن تاریکی سے روشنی میں آرہے ہیں۔ میں آئندہ اردو زبان کی ساخت و سرشت سے بحث کروں گا، اس سے اس نکتے کی وضاحت ہوگی۔

اردو کی ساخت اور اس کی سرشت

آغاز اور ارتقا کے ساتھ زبان کی ساخت و سرشت کا جاننا بھی ضروری ہے ورنہ زبان سے پوری پوری آگاہی حاصل نہ ہوگی لیکن اردو کی ساخت و سرشت پر بحث سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ زبان کی ساخت و سرشت سے کیا مراد ہے؟ زبان کی ساخت، اس کا ڈھانچا، کینڈا یا ڈول ہے جو زبان کو دوسری ہمسر زبانوں سے ممتاز بناتا ہے۔ زبان اپنی ہیئت، امتیازی خط و خال خصائص و احوال سے پہچانی جاتی ہے اس لئے زبان کے خط و خال اور امتیازی صفات کو زبان کی ساخت کہا جائے گا۔ سرشت زبان کی سیرت اور اس کا فطری رجحان ہے۔ ہر زبان کے ارتقا کی ایک روش ہوتی ہے۔ ایک خط سیر جس پر زبان آگے بڑھتی اور ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے۔ زبان کی ساخت اس کی فطرت ہے اور زبان کی سرشت اس کے فطری تقاضے۔

اردو زبان کی ساخت کے سلسلے میں یہ امر خاص طور سے پیش نظر رہنا چاہئے کہ اردو ہند آریائی خاندان کی زبان ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، چار واسطوں سے قدیم ہند آریائی تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان کی دوسری جدید زبانوں یعنی پنجابی، سندھی، راجستھانی، گجراتی، مراٹھی کی طرح بنیادی الفاظ مادے، سابقے، لاحقے اردو کو اپنی اصل ہند آریائی سے ترکے میں ملے۔ اردو کا تمام تر بنیادی سرمایہ ہند آریائی ہے۔ وضع الفاظ اور اخذ و اشتقاق کے قاعدے ہند آریائی ہیں، تختیں اور گردانیں ہند آریائی ہیں، اسما کی تصریف اور ان کے اعرابی لاحقے ہند آریائی ہیں، اس خصوصیت میں اردو اپنی ہم سر اور ہم عصر بولیوں کی برابر کی شریک ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں بھی وہ ان کی شریک ہے کہ اس کا نحوی تانا بانا یعنی الفاظ کی ترتیب غیر آریائی ہے جو نتیجہ ہے دراوڑ اور کول زبانوں سے تاثر کا۔ اردو کا صرفی حصہ آریائی ہے اور نحوی حصہ دراوڑ یا منڈا۔

اردو اپنی فطرت سے بڑی ہی ملنسار، اپلی گہلی، اور ہر زبان سے گھل مل کر شیر و شکر ہو جانے والی زبان ہے۔ قدیم پراکرت اور سنسکرت سے تو اس کا ناتا ہے ہی، فارسی، عربی، پشتو، پرتگالی، کول، انگریزی دراوڑ زبانوں سے بھی اس کا خلا ملا رہا ہے۔ ان سب سے اس نے کچھ نہ کچھ لیا اور چراغ سے چراغ جلایا ہے۔ اردو ہر چند ایک خاص علاقے کی زبان ہے جہاں اس نے آنکھ کھولی اور جہاں وہ پروان چڑھی لیکن وہ اس علاقے میں محصور نہیں رہی۔ اس نے اپنے مولد و منشا سے قدم باہر نکالا۔ ملک کے گوشے گوشے میں گئی اور اپنی ضرورت کے مطابق ؎

تمتع زہر گوشۂ یافتم

ہر گوشہ سے اس نے تمتع حاصل کیا۔ ہر چمن سے اس نے اپنا دامن بھرا۔ بقول ڈاکٹر چیٹرجی:

"علاقائی زبانوں کی طرح ضروری اور معانی سے بھرپور اجنبی الفاظ کے بارے میں اردو کا رویہ کبھی یہ نہ رہا 'مجھے ہاتھ نہ لگانا'۔"

اردو کی فطرت کا یہ وہ پہلو ہے جس پر میں سب سے پہلے زور دینا چاہتا ہوں۔

اس کے بعد اردو کے صوتی سرمایہ کو لیجئے۔ مصمت (Consonants) اور مصوت (Vowels) دو قسم کی آوازیں ہیں۔ مصمت کو صحیح اور مصوت کو حرکت و علت (یا اعراب) کہتے ہیں۔ اردو کی مصمت آوازیں واضح، نمایاں اور جلی التلفظ ہیں۔ اہل اردو کچھ اس طرح ان آوازوں کو ادا کرتے ہیں کہ ان میں کسی طرح کا ابہام، خلط یا اشتباہ نہیں ہوتا، ہر آواز دوسری سے ممتاز رہتی ہے اور گرد و پیش کی کسی دوسری آواز سے دبنے نہیں پاتی۔ اردو "ہ" اور ہائیہ (Aspi-rates) یعنی کھ، گھ، چھ، جھ، ٹھ، ڈھ، تھ، دھ، پھ، بھ کا تلفظ جیسا کہ چیٹرجی نے لکھا ہے صاف، صحیح اور واضح طریقے سے کرتی ہے۔ بنگلہ کی طرح نہ اس کی ادائی ضعیف و ناتواں ہے اور نہ پنجابی اور گجراتی کی طرح مجہول یا گھٹی گھٹی۔ یہ واضح طرز ادا کا اثر ہے کہ اردو نے ر، ڑ، ل، م، ن کو بھی ہائیہ بنا لیا ہے۔ چنانچہ قدیم ہائیوں کے پہلو بہ پہلو، جو اوپر مذکور ہوئے اردو میں رھ، ڑھ، لھ، مھ، نھ، پانچ نئے ہائیے ہیں۔ جیسے، کوڑھ، کولھوں، تمھارا، ننھا، سرھانا وغیرہ۔

سرھانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

"ہائیہ" کا وجود اردو کی صوتی خصوصیت ہے۔ مشرقی علاقے کے باشندے ہائیہ کا ٹھیک ٹھیک تلفظ نہیں کر سکتے تھے اس لئے محمد شاہ تغلق نے (پنجاب میں اردو میں ہ) لفظ "کھڑا کھڑی" کے تلفظ کو دہلوی (اردو بولنے والے) اور غیر دہلوی (پوربی اور بنگالی) باشندوں کی شناخت

قرار دیا تھا۔

ادیچیہ (شمال مغربی) اور پراچیہ (مشرقی) زبانیں "س" کے تلفظ پر قادر نہ تھیں۔ اول الذکر زبانوں میں "س" کو "ہ" سے بدل لیا گیا تھا اور ثانی الذکر زبانوں میں "ش" سے۔ مدھیہ دیش کے علاقے میں "س" بدستور برقرار رہا۔ آج اس علاقے کی نمائندہ زبان اردو "س" کا ٹھیک ٹھیک تلفظ کرتی ہے اور گنے چنے لفظوں کو چھوڑ کر، جن پر پاس پڑوس کی زبانوں کا اثر ہے، جیسے گیارہ، بارہ وغیرہ۔ اردو میں پراکرت عہد کا "س" جوں کا توں اصلی شکل وصورت میں موجود ہے۔ بلکہ بعض "ش"، روپ بدل کر "س" ہو گئے ہیں۔ جیسے سل (س: شلا)، آنسو (س: اشر)، سانس (س: شواس)، پھانس (س: پاش)، بھینس (مہش)، سو (س: شت)، ساگ (س: شاک) سولہ (س: شوڈش)۔

مدھیہ دیش کی پراکرت کی تقلید میں اردو نے "ر" اور "ل" میں امتیاز رکھا۔ مشرقی زبانوں میں "ل" "ر" کا قائم مقام ہے۔ چنانچہ بہاری بولیوں میں گالی کو گاری کہا جاتا ہے اور پھل کو پھر۔ بدلی (بادل کا ٹکڑا) اردو ہے اور "بدری" یا "بدریا" اودھی۔

اردو میں قدیم "د" قریب قریب ہر جگہ "ب" سے بدل گیا ہے۔ اس کے برعکس اردو نے پنجابی کی طرح "ب" کو کبھی "د" سے نہیں بدلا۔

اردو عموماً "ڈ" کو "ڑ" بنا لیتی ہے خواہ یہ "ڈ" قدیم پراکرت دور کی ہو۔ جیسے:

سنسکرت	اردو
اُڈڈی	اڑنا
جاڈے	جاڑا

یا درمیانی پراکرت دور کی۔ جیسے:

پراکرت	اردو
گھوڈو	گھوڑا
گھڈو	گھڑا
کڈاہو	کڑاہی
کواڈو	کواڑ
کپڈو	کپڑا

وڈو — بڑا

کیڈو — کیڑا

اس سے معلوم ہوا کہ پنجابی اور ہریانی (بانگڑو) کے خلاف اردو کا میلان "ڑ" کی طرف ہے۔

خالص فارسی، عربی آوازیں یعنی ز، ژ، ف، ق، غ، ط وغیرہ کو ڈاکٹر چٹرجی اہم اور ضروری قرار دے کر فرماتے ہیں کہ یہ آوازیں اردو میں ہیں، ہندی ان سے محروم ہے۔ اگرچہ اردو نے پوری طرح انھیں نہیں اپنایا لیکن اردو میں ان کا وجود یا کم سے کم ج، ز یا ق، ک، خ کے تلفظ میں فرق و امتیاز اردو کی صوتی خصوصیت ہے۔ بنگلہ کی طرح اردو ج کا ز، ز کا ج یا پنجابی کی طرح ق کا ک یا دکنی کی طرح ق کا خ تلفظ نہیں کرتی۔

اردو مصوتے سہل بھی ہیں اور سادہ بھی۔ زیر، زبر، پیش تین حرکتوں (قصیر مصوتوں) اور ان کی تین طویل صورتوں (ا، و، ی) کے علاوہ اردو میں حسب ذیل چار علتیں ہیں ے مجہول (اِے)، ے لین (اَے)، و مجہول (اُو)، و لین (اَو)۔ خاص خاص صورتوں میں جب مثلاً قصیر مصوتوں کے بعد کا حرف ح یا ع ہو اردو میں ان علتوں کی مختصر اور خفیف آوازیں بھی سننے میں آتی ہیں۔ جیسے: احرام (اے کی خفیف آواز)، احمد (اَے کی خفیف آواز) عہدہ (او کی خفیف آواز)، بہت (اَو کی خفیف آواز) لیکن مراٹھی اور بنگلہ کی طرح اردو کا اعرابی نظام (Vowel System) پیچیدہ یا گرہ در گرہ نہیں بلکہ سادہ ہے اور اس کے سادہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک مقطع یا جز میں دو مصوتوں کی یکجائی (Hiatus) اردو برداشت نہیں کرتی۔ اپنی عام سادہ سرشت کے مطابق ان مصوتوں کو گھلا ملا کر طویل حرکت یا علت میں تبدیل کر لیتی ہے۔ ہم جنس دو حرکتیں طویل ہو جاتی ہیں۔ جیسے: کرت، کد، ک، ہ، کا۔

مختلف جنس کی دو حرکتیں مرکب علت سے بدل جاتی ہیں۔ (اُاُ) اَو ہو جاتا ہے۔ جیسے: اپر۔ اور۔ اَار۔ اور (اَا) اے بن جاتا ہے۔ جیسے: کئیسن۔ کیسا۔ یا بعد کی حرکت ما قبل حرکت کی نسبت سے 'و' یا 'ی' سے بدل جاتی ہے۔ جیسے: ہئا سے ہوا۔ یا ایک حرکت حذف ہو جاتی ہے جیسے رکھا سے رکھا۔ مارا سے مارا۔

اردو کے قواعدی انداز قد و قامت پر گفتگو سے پہلے دو ایک صوتی خصوصیات کا ذکر اور کروں گا۔ بنگلہ، سندھی، اودھی، برج، آسامی، ہندی وغیرہ زبانوں کے اکثر اسما و صفات متحرک الآخر ہیں یعنی زیر زبر یا پیش پر ختم ہوتے ہیں۔ اردو کا کوئی کلمہ ایسا نہیں جس کے آخر میں کوئی

حرکت (قصیر مصوتہ) ہو۔ اس کے اسما، صفات، افعال یا صحیح الاخر ہیں یعنی کسی حرف صحیح یا غنہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ جیسے: آج، کل، پرسوں، صبح، شام، رات وغیرہ۔ یا معلول الاخر ہیں یعنی ا، د، ی پر ختم ہوئے ہیں، جیسے: اچھا، کپڑا، کوا، کھجلی، بچھو، بچھونا وغیرہ۔

اردو کلمے کے آخر میں دو مختلف الجنس صحیح آوازوں کا اختلاط کسی حد تک گوارا کر لیتی ہے لیکن ہم جنس دو صحیح آوازوں کی ہم آغوشی اس کی سرشت کے خلاف ہے۔ اس صورت میں وہ یا تو تخفیف کرے گی یعنی دو آوازوں میں سے ایک کو گرا دے گی۔ جیسے کل (کلّ، کلیہ) نتھ (نتھہ، نست) یا اشباع و تسہیل سے کام لے گی یعنی مصمتہ کو گرا کر ما قبل مصوتہ کو کھینچ دے گی۔ جیسے:

آج (اَج، ادی)، ناتھ (نتھہ، نست)، کام (کمّ، کرم)، دھام (دھمّ، دھرم)، رات (رتّ، راتر)، چام (چمّ، چرم)، کوب (کبّ، کبج)۔

فارسی دخیل الفاظ مرد، شرم، نرم، گرم، گوشت، پوست وغیرہ کے علاوہ جو اردو میں اچھی طرح رچ بچ کر اردو نہ بن سکے۔ اردو کے حسب ذیل چند الفاظ مخلوط التلفظ ہیں:

دنڈ، پنڈ، جھنڈ، کنڈ، لنڈ، منڈ۔

اک بے نوا کے لڑکے پہ مرتے ہیں شیخ جی
عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لنڈ منڈ پر

فارسی دخیل الفاظ اہل اردو کے جنتر پر چڑھالیے گئے اور ما قبل آخر کو متحرک کر کے شرم کو شرَم، نرم کو نرَم، گرم کو گرَم یا آخری حرف صحیح کو کھینچ کر مست کو متا کہا جانے لگا۔ گوشت، پوست وغیرہ الفاظ حرف علت "و" کی وجہ سے گوارا کر لئے گئے۔ رہے "ن" کے ساتھ مخلوط ہونے والے الفاظ سو ان کے زبان پر باقی رہ جانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ن (غنہ) خفیف التلفظ ہے۔ حرف صحیح کے ساتھ گھل مل جانے کے بعد بھی اس میں سختی یا درشتی نہیں آتی۔

اردو شمال مغرب اور مشرق کی زبانوں کے مقابلے میں بین بین ہے یعنی میانہ حیثیت رکھتی ہے۔ پنجابی میں دو حرف صحیح پر ختم ہونے والے (مشدد) الفاظ کی کثرت ہے۔ بنگلا وغیرہ مشرقی زبانوں میں حرکات پر ختم ہونے الفاظ کی۔ اردو میں ایک حرف صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ ہیں۔ اردو میں مردانہ پن ہے، سختی اور درشتی نہیں۔

گرامر کے لحاظ سے بھی اردو مقابلتاً سادہ اور سہل واقع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر چٹرجی فرماتے

ہیں کہ اردو کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ گریرسن کی مشہور کتاب "ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ" کا ایک صفحہ اس کے قواعد کے لئے کفایت کر گیا جب کہ بنگلا، مراٹھی، تامل، تیلگو کے لئے مصنف کو دو صفحے وقف کرنے پڑے۔ مشرقی پنجابی کے لئے تین اور میتھلی کے لئے پورے چار۔ روزانہ بول چال کی اردو کے قاعدے اس سے کہیں زیادہ مختصر ہیں جنھیں چٹرجی کی رائے میں زیادہ سے زیادہ ایک معمولی پوسٹ کارڈ پر لکھا جا سکتا ہے۔

مغربی ہندی کی ایک خصوصیت ڈاکٹر گریرسن نے یہ بتائی تھی کہ وہ مکملاً تحلیلی (Analy-tical) زبان ہے جس میں صرف ایک فعل مضارع ہے اور اسم کی ایک غیر فاعلی (Oblique) اعرابی حالت۔ گردانیں اور بخشیں اسم حالیہ ومعاون افعال کی مدد سے ظاہر کی جاتی ہیں اور اعرابی حالتیں حروف وغیرہ کی مدد سے۔ یہ خصوصیت اردو کی ہے۔ اردو میں صرف فعل مضارع ہے جس کے چار صیغے ہیں۔ کرے، کریں، کرو، کروں۔ ان پر گا بڑھا کر فعل مستقبل بناتے ہیں۔ پنجابی، گجراتی، راجستھانی، برج وغیرہ زبانوں میں فعل مستقبل مضارع سے الگ ہے جو "س" کے اضافے سے بنتا ہے (پنجابی، گجراتی، راجستھانی وغیرہ میں) یا "ہ" کے اضافے سے (برج میں)۔

اردو ماضی حالیہ تمام سے بناتی ہے اور فعل حال حالیہ ناتمام سے۔ ان کے صیغے تمام تر تحلیلی ہیں۔ فاعلی کی ضمیریں فعل سے الگ رہتی ہیں۔ اس لئے فعل میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ماضی :- وہ گیا۔ وہ گئے۔ تو گیا۔ میں گیا۔ ہم گئے = گیا۔ گئے (۲ صیغے)

حال :- وہ جاتا ہے۔ وہ جاتے ہیں۔ تو جاتا ہے۔ تم جاتے ہو۔ میں جاتا ہوں۔
ہم جاتے ہیں = جاتا۔ جاتے (۲ صیغے)

اردو میں صرف ایک ظرفی حالت "تالیفی" ہے جو خاص خاص ظرفوں میں استعمال ہوتی ہے جیسے اندھیرے، اجالے، دریا کنارے وغیرہ بقیہ تمام اعرابی حالتیں تحلیلی ہیں جو حروف وغیرہ کی مدد سے گردانی جاتی ہیں۔ فعل مجہول اردو کے تحلیلی مزاج کے مطابق 'جانا' اور اس کے صیغوں کی مدد سے وضع کیا جاتا ہے۔

اردو ان تمام غیر ضروری صرفی نحوی پیچیدگیوں سے پاک ہے جو کبھی اردو کے قدیم یا قدیم ترین دور میں اردو سے اکاس بیل کی طرح چمٹی ہوئی تھیں۔ اس کی بعض ہمسر بولیوں میں آج بھی موجود ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اردو نے وہ تمام اعرابی لاحقے جنھیں بآسانی تراشا جا سکتا تھا چھانٹ کر مختصر کر دیئے۔ "آتی تھیں" اردو میں اولاً "آتیاں تھیں" تھا۔ اس کے

بعد "آتیں تھیں" ہوا۔ آخر میں "آتی تھیں"۔ "گرٹی گھڑیاں" اختصار ہے "گرٹیاں گھڑیاں" کا۔ میر کے زمانے تک لوگ، لوگاں کی شکل میں تھا۔ (دکن میں آج بھی بولتے ہیں) غالباً اٹھارہویں صدی کے ربع آخر تک "بھی ہیں" "رہی ہیں" کو "بہیں ہیں" "رہیں ہیں" بولا جاتا تھا۔ مرزا جان تپش کی ایک غزل "نہیں ہیں" کی ردیف میں ہے۔ اس میں ذیل کے مصرعے اس زمانے کی زبان کی یاد دلاتے ہیں:

فرقت میں جن کی ہم نے یہ حالتیں سہیں ہیں

خوناب پھر تو دل کی جوئیں کئی بہیں ہیں

باتیں ابھی تو تم سے کہنی بہت رہیں ہیں

پنجابی زبان کا یہ حسین جملہ ملاحظہ ہو جیسے مولانا شیرانی مرحوم جمع کا گلدستہ بتاتے ہیں۔

"اودے وچ کتباں ساریاں وڈیاں وڈیاں کوٹھریاں رنگ برنگیاں بعضیاں چاندی دیاں بعضیاں یاقوت دیاں"۔

اردو میں یوں لکھیں گے "اس میں کتنی ساری بڑی بڑی رنگ برنگی کوٹھریاں بعض چاندی کی بعض یاقوت کی"۔ پورے جملے میں صرف ایک اسم کوٹھری جمع ہے۔ صفات سب مفرد ہیں۔

اردو میں وضع الفاظ کا ایک طریقہ ترکیب ہے جس نے اردو کو آسان بنایا اور اظہار و بیان کی نئی نئی راہیں اس کے سامنے کھولیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اسم و فعل کو ترکیب دے کر فعل بنانا، جیسے: آواز دینا، صاف کرنا، کھوج لگانا، دریافت کرنا، بیوقوف بنانا، اس میں محاورے شامل ہیں، جیسے:

سر کھپانا، سر اٹھانا، ناک بھوں چڑھانا، پہلوتہی کرنا، ان بن ہونا۔

۲۔ دو اسموں کو ملا کر مرکب تیار کرنا۔ جیسے:

چھوٹا بڑا، لیا پتا، بندھا ٹکا، لیا دیا، نیا پرانا، رہا سہا، اونچ نیچ وغیرہ۔ متوازن ہم قافیہ فقرے اس سلسلے میں آتے ہیں، جیسے:

اڑوس پڑوس، آس پاس، بن ٹھن، جل تھل، جھل مل، تام جھام، رم جھم، لوٹ پوٹ، نٹ کھٹ۔

اردو کے پڑوس میں اردو سے ملتی جلتی جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں اردو اور ہریانی (جو اردو ہی کی ایک بولی ہے) "ا" والی زبانیں ہیں۔ برج بھاشا اور قنوجی "و" اور "و" والی۔ اردو ہریانی کے عام مذکر اسما، افعال، صفات "ا" پر ختم ہوتے ہیں۔ برج بھاشا اور قنوجی کے "و" اور "و" پر۔ جیسے:

میرو بیٹو آیو یا میرو بیٹو آیو۔ وانے میرو کہیو نہ مانیو یا وانے مہارو کہیو نہ مانیو۔ اردو میں یوں کہیں گے۔ میرا بیٹا آیا۔ اس نے میرا کہا نہ مانا۔ اردو (ہریانی) میں اسمار عامہ کی غیر فاعلی حالت میں "س" ہوتا ہے، جیسے: اس، جس، تس، کس۔ برج بھاشا اور اس کی ساتھ کی زبانوں میں "س" کی جگہ "ا" آتا ہے۔ جیسے:

وا، تا، یا، جا، کا۔

نا، تا، گا اردو کی فطرت میں داخل ہیں۔ 'نا' مصدری لاحقہ ہے۔ جیسے:

آنا، جانا، پانا، لانا وغیرہ۔

برج میں "بو" یا "وو" مادے پر اضافہ کر کے مصدر بناتے ہیں۔ بعض مصادر میں 'نو' بھی ملا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اردو 'نا' کو 'نو' بنا لیا گیا ہے۔ اکبر کے عہد تک برج میں 'بو' کا رواج تھا۔ اکبر کا ایک دوہا ہے۔

پیتھل سون مجلس گئی تان سین سون راگ
ہا سیبو، رمی بو، بو لبو، گیو بیر بل ساتھ

'تا' حالیہ ناتمام کی علامت ہے۔ آتا، جاتا، پڑھتا وغیرہ۔ اردو میں اس پر "ہے" بڑھا کر فعل حال بناتے ہیں۔

آتا ہے، جاتا ہے، پڑھتا ہے، اور 'تھا' بڑھا کر ماضی ناتمام۔ جیسے: آتا تھا، پڑھتا تھا وغیرہ۔

"گا" علامت استقبال بھی اردو کا خاصہ ہے۔ برج اور اس کے ساتھ کی دوسری زبانیں 'سو' یا 'ہو' (جو 'سو' کی ایک شکل ہے) لگا کر فعل مستقبل بناتی ہیں۔ برج میں "گو" ہے لیکن یہ اردو سے مستعار لیا گیا ہے۔ مولانا شیرانی فرماتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ جس طرح مصدر کی علامت 'نو' اس طرح مستقبل کی علامت "گو" اردو سے لی گئی ہے۔

(پنجاب میں اردو ص ۱۰۰)

یہ امر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ معراج العاشقین میں جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، فعل مستقبل دکنی مصنفین کے خلاف 'س' کی جگہ 'گا' کے اضافے سے بنا ہے۔ صرف ایک جملہ ملاحظہ ہو :

"جے کوئی لباس تن کا نام رکھے گا اوڈ پچھانت کا شراب نہ پی سکے گا۔" (ص ۲۵)

کا، میں، پر، سے، وغیرہ مغیرہ کلمات کو، جن کی مدد سے اسمار و ضمائر کو گردانا جاتا ہے، ڈاکٹر چٹرجی اردو کی خصوصیات میں شمار کرتے ہیں۔ اپنی ساخت اور استعمال کے لحاظ سے یہ اردو ہیں۔ اردو میں قدیم سے استعمال ہو رہے ہیں۔ دکنی میں "کا قائم مقام کیرا" تھا۔ غواصی :

کہ ہے چاکری مرد کیرا سنگار

امین دکنی :

جو قاصد کیرے ہتھ نامہ چڑایا

معراج العاشقین میں "کا" ہے۔

"پہیلا تن واجب الوجود مقام اس کا شیطانی۔" (ص ۱۹)

مین، پر، سے بھی معراج العاشقین میں استعمال ہوئے ہیں۔ "مین" کی مثال :

"لوگاں کو انسان کے سینے میں درس دیتا ہے۔" (ص ۲۱)

"پر" کی مثال :

"لاہوت کے صدر پر ان کا تخت لاکو رکھے۔" (ص ۲۲)

"سے" کی مثال :

"اس دونوں کی پیدائش آدم سے محمد لگ یک لک چوبیس ہزار پیمبراں ہوئے۔" (ص ۲۲)

"نے" کو بھی میں اردو ہی کی ملک سمجھتا ہوں اور اس پر اپنے ایک مضمون "نے کی سرگذشت" میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ ذیل کے کلمے (لاحقے) بھی اردو کے ساتھ خاص ہیں :

(۱) کو (علامت مفعولی)، (۲) تک (حرف)، (۳) وں (علامت جمع غیر فاعلی حالت میں)۔

یہ کلمے اور لاحقے اردو کی فطرت میں شامل ہیں۔ جس زبان میں یہ کلمے ہوں اور اس کے مادے ہند آریائی سے لئے گئے ہوں وہ اردو ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کلمے اپنی موجودہ شکل میں نہ ہوں یا کسی زبان کے اثر سے ان میں جانا بیجانا تغیر کر لیا گیا ہو۔ جیسے :

تو لگ یا لگ، کوں، سین وغیرہ جو بہ ترتیب تک، کو، سے کی دکنی شکلیں ہیں۔

نظامِ اصوات و علامات

بیش تر ماہرینِ صوتیات، جیسا کہ دی ساسور نے لکھا ہے، کسی آواز کے اپنے مخرج سے نکلنے یا ادا ہونے تک اپنی بحثوں کو محدود رکھتے اور اس کے سماعی پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ انداز نظر بے بصری سے پاک نہیں۔ ہر صوتی عمل کے دو پہلو ہیں: ایک فعلی اور یہ آواز کا منھ کے کسی حصہ سے ٹکراکر اور ہوا کا سر سراکر نکلنا ہے۔ دوسرا انفعالی، یہ سننے والے کے پردہ گوش پر جاکر آواز یا موج ہوا کا متصادم ہونا اور اس کے ارتعاشات کا ذہن تک پہنچنا ہے۔ اولین پہلو تلفظ (Phona tion) ہے، دوسرا سماع (Audition) یہ دونوں پہلو صوتیات میں اہم ہیں۔ کسی زبان کے صوتیوں (Phonemes) پر بحث کرتے وقت یہ دونوں پہلو بہر حال سامنے رکھنے چاہئیں۔

لیکن بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے صوتیہ کی وضاحت اور اس کی حقیقت کی نقاب کشائی ضروری ہے۔ قائل یعنی بولنے والے کے منہ سے جدا جدا مختلف آوازیں نہیں نکلتیں۔ پانی کی روانی کی طرح آوازوں کا ایک مستمر سیلان یا سلسلہ ہوتا ہے جو طویل بھی ہو سکتا ہے اور قصیر بھی۔ طویل سلسلے کو جملہ یا فقرہ کہتے ہیں اور قصیر کو لفظ یا کلمہ۔ آوازوں کا ہر چھوٹا، بڑا سلسلہ عموماً مختلف النوع آوازوں پر مشتمل ہوا کرتا ہے۔ قوت سامعہ کے علاوہ کوئی خارجی ذریعہ ایسا نہیں جو اس سلسلے کی مختلف آوازوں کو الگ الگ کر دے۔ سامع کا ذہن البتہ یہ کام نقوش و ارتسامات کی مدد سے انجام دیتا ہے مثلاً جب کوئی قائل چل کہتا ہے تو سننے والے کے ذہن پر "چ" اور "ل" کی آوازیں مرتسم ہو جاتی ہیں۔ "چ" کی آواز پہلے اور "ل" کی آواز بعد میں۔

سلسلۂ صدا کی تقسیم و تفریق نیز ترتیب، قوت سامعہ، یکسانی اور اختلاف کی بنا پر کرتی ہے۔ جہاں کسی سلسلے کی یکساں آواز کے بعد اس سے مختلف آواز کا آغاز ہوا، قوت سامعہ نے خط فاصل

کھینچ کر پہلی آواز کو دوسری سے اور دوسری کو تیسری سے الگ کر دیا۔ ذہن کی ارتسامی قوت ایک لطیف اور سریع التاثر لوح (پلیٹ) کی طرح ہے، جس پر صوتی سلسلے کی ہر آواز واضح ہو یا غیر واضح نقش ہوتی چلی جاتی ہے۔ شعور آوازوں کے نقوش کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف خانوں میں بانٹتا اور ان کے جدا جدا حلقے بناتا ہے۔ "چت کبرا" مثلاً آوازوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اسے ایک افقی خط مستقیم یعنی سیدھی پڑی لائن تصور کیجئے اور اس پر چھوٹے چھوٹے عمودی خطوط کھینچئے۔ چھوٹی لائنوں سے بڑی لائن پر جو مختلف خانے بنیں گے وہ سلسلۂ صدا کی آوازوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ کریں گے۔ اس طور پر:

جِ	تُ	کَ	بُ	رَ	ا

اس جدول کی افقی لائن سلسلۂ صدا ہے اور اس پر ستون کی طرح کھڑے ہوئے خطوط سلسلۂ صدا کے سیلان و استمرار کو کاٹ کر اس کے حصے بناتے ہیں۔

دی ساسور کہتا ہے: سلسلۂ صدا کی تقطیع میں آواز کی یکسانی ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ ہر یکساں آواز ایک صوتی اکائی (Sound Unit) ہے۔ مد و قصر یا طوالت و اختصار کی یہاں کوئی اہمیت نہیں۔ سلسلۂ صدا میں برابر کی ضربات شمار نہیں کی جاتیں۔ یکساں اور ایک نوعیت کی آوازیں شمار میں آتی ہیں۔ چنانچہ 'دل' اور 'دال' یا 'چل' اور 'چال' میں قوت سامعہ کوئی فرق محسوس نہیں کرتی۔ اس کے نزدیک یہ کلمے ایک قسم کے دو جوڑے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مغرب کے اہل علم لاطینی رسم تحریر سے فریب کھا کر یہ کہتے ہیں کہ طول و قصیر ضربات و نقرات میں سماعی طور سے کوئی فرق نہیں اس لئے کہ رومن میں 'دل' اور 'دال' دونوں Dal لکھے جاتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو کان کے پردے پر صرف ضربات یا نقرات / Beats محسوس کی جاتی ہیں۔ ان کی نازک کیفیات و خصوصیات کا احساس اور تجزیہ قوت سامعہ کے اختیار سے باہر ہے۔ مثلاً 'جال' اور 'آج' کے 'ج' میں تلفظ کی حد تک تو فرق ہے۔ پہلا ج + ے ہے اور دوسرا صرف 'ج'۔ لیکن قوت سامعہ صرف 'ج' کی آواز محسوس کرتی ہے۔ اس کی کیفیات کا اسے احساس نہیں ہوتا، اس لئے میں نے اوپر کی جدول میں حرکات کو حروف سے الگ نہیں کیا اور 'ج ِ' اور 'ک ـَ' کی جگہ 'ج' اور 'ک' لکھا ہے۔ اس پر آئندہ ذرا تفصیل سے لکھوں گا۔

سلسلہ۔ صدا کے یہ مختلف ٹکڑے صوتیے ہیں جو قوت سامعہ کے تحلیلی عمل کا نتیجہ ہیں اور جنھیں مذکورہ بالا جدول کے عمودی خانوں میں بٹا ہوا دکھایا گیا ہے۔ تلفظ کی اکائی صوت ہے اور سماع کی اکائی حرف۔ صوتیہ تلفظ اور سماعی تاثر دونوں کے اعتبار سے اکائی ہوتا ہے۔ اس لئے اسے ایک پیچیدہ اور مخلوط قسم کی اکائی سمجھئے۔ ماہرین صوتیات نے صوتیے کی پرکھ کا ایک طریقہ بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں جس حرف کے بارے میں یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ صوتیہ ہے اسے کلمے میں کسی دوسرے حرف سے بدل دیا جائے۔ تبدیلی کے بعد بامعنی کلمہ حاصل ہو تو وہ صوتیہ ہوگا۔ مثلاً 'جال' ایک کلمہ ہے۔ اس میں 'ج' صوتیہ ہے اس لئے کہ 'دال'، اس کا ہم وزن بامعنی کلمہ اردو میں موجود ہے۔ 'س' صوتیہ ہے اس لئے کہ 'سال' اور 'ٹال' اردو کے دو بامعنی کلمے ہیں، جن میں سے ایک میں 'س' ہے دوسرے میں 'ٹ'، باقی حرف دونوں میں مشترک ہیں۔ 'ا' کے صوتیہ ہونے کا ثبوت 'مال'، 'میل'، وغیرہ کلمے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ امر خاص طور سے پیش نظر رہے کہ صوتیہ کے باب میں تلفظ کی یکسانی اور اختلاف یا تحریر کی یکسانی اور اختلاف کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کی حقیقت کا معیار وہ طریقہ ہے جو اوپر بیان ہوا۔ جو حرف (آوازیں) اس طریقے پر پوری نہ اتریں، وہ صوتیے شمار نہ ہوں گے۔ مثلاً انگریزی (Kingcup) کے K اور C کی شکلیں بھی مختلف ہیں اور آوازیں بھی (یہ فرق بہت نازک ہے اور صرف نازک آلے سے دریافت ہو سکتا ہے) اس کے باوجود یہ دو صوتیے نہیں اس لئے بقول مسٹر راس انگریزی کے دو کلمے تنہا ان آوازوں سے ممتاز نہیں ہوتے۔ جاپانی میں H کی دو آوازیں ہیں۔ Hana (= پھول) میں H 'ہ' کا ہم آواز ہے اور Hito (= انسان) میں جرمن CH کا۔ لیکن جاپانی میں کوئی دو لفظ ایسے نہیں جن میں ان دو آوازوں کی وجہ سے فرق کیا جا سکے اس لئے ان دو آوازوں کا اختلاف جاپانی میں صوتیوں کا اختلاف نہ ہوگا۔ مسٹر راس نے اس قسم کی متعدد مثالیں مختلف زبانوں سے پیش کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے:

"ایک زبان کا غیر صوتیاتی اختلاف دوسری زبان کا صوتیاتی اختلاف ہو سکتا ہے۔"

"صوتیہ" کے مفہوم کی وضاحت کے بعد علامات یعنی حروف کا سوال سامنے آتا ہے۔ یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ حروف صوتیوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کی تحریری یا رسمی شکلیں نظر کے سامنے پیش کرتے ہیں اس لئے قاعدے کے مطابق حروف کا وہی نظام جامع اور مکمل سمجھا جائے گا جو زبان کے صوتیاتی نظام کے مطابق اور پوری طرح اس سے ہم آہنگ ہو، یعنی جس میں ہر صوتیہ

تنہا ایک حرف کا نمائندہ ہو اور حرف صرف ایک صوتیے کا۔ یونانی ابجد کو مکمل بتایا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں ہر سادہ (بسیط) آواز کی صرف ایک تحریری علامت ہے اور ہر تحریری علامت تنہا ایک بسیط آواز کو ظاہر کرتی ہے۔ مسٹر ساسور کا بیان ہے کہ قدیم یونانی ابجد میں مفرد آواز کے لئے مرکب علامت نہ تھی، جیسے انگریزی میں 'ش' کے لئے SH ہے، نہ ایک مفرد آواز کو دو مختلف علامتوں سے ظاہر کیا جاتا تھا، جس طرح رومن میں 'س' 'ک' C اور S ، دو علامتوں سے ظاہر کیا جاتا ہے اور نہ مرکب یا مخلوط کے لئے ایک علامت مقرر تھی، جیسے رومن 'X' 'اکس' (ک+س) کی علامت ہے۔ رومن حروف کی اس بے قاعدگی اور ناہمواری کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے اور مسٹر راس نے لکھا بھی ہے کہ انگریزی رسم تحریر دنیا کے ناقص ترین حروف میں سے ہے۔

اردو حروف عربی حروف سے ماخوذ ہیں جنھیں ڈاکٹر جونز نے خود عربی کے لئے بڑی حد تک جامع اور مکمل بتایا تھا۔ ٹھیٹ ہندی اور فارسی آوازوں کے لئے عربی حروف میں ترمیم کر کے انھیں اردو کے مزاج کے مطابق ڈھال لیا گیا۔ اردو حروف کا نظام اب اردو صوتیات سے پوری طرح ہم آہنگ اور اس کی ضرورتوں کے مطابق ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سے پہلے دو ایک اعتراضوں کا جائزہ لیتے چلیں۔

اردو حروف پر اعتراض ہے کہ ہائیہ بسیط آوازیں ہیں۔ اردو میں انھیں 'ھ' اور وقفیہ کی ترکیب سے بھ، پھ، تھ، ٹھ، دھ، ڈھ، جھ، چھ، کھ، گھ لکھا جاتا ہے۔ یہ اردو تحریر کی کم مائیگی کی دلیل ہے:

"یہ آوازیں اپنی وسعت اور تقسیم کے باعث اردو کے نظام صوت کی مفرد آوازیں ہیں۔ ہندی رسم خط میں ان کے لئے علاحدہ حروف بھی قائم کئے گئے ہیں لیکن اردو حروف تہجی میں یہ مرکب آوازیں تصور کی گئی ہیں اور اسی بنا پر اردو تدریس کا یہ انداز ہنوز جاری ہے کہ گ ھ ر زبر 'گھر' ب ھ ر زبر 'بھر' جو صوتی نقطۂ نظر سے مہمل ہے۔"[1]

ایک صاحب فرماتے ہیں:

"اردو میں دس منفوس (Aspirated) آوازوں کو منفرد آواز کا درجہ دیا جا سکتا ہے کیوں کہ ان میں 'ھ' اس طرح شیر و شکر ہو گئی ہے کہ پوری آواز ایک ہی کوشش اور ایک ہی

[1] "اردوئے معلیٰ" لسانیات نمبر (ص ۱۱۹)

جھٹکے میں ادا ہوتی ہے۔[1]

اس اعتراض پر میں نے اپنے مقالے "اردو کی ہائیہ آوازیں" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کروں گا کہ صوتیات کی رو سے ہائیہ آوازیں مفرد نہیں مخلوط (Complex) ہیں جن میں 'ہ'، وقفیہ سے گھل مل کر یک جان ہو گئی ہے۔ اردو میں ان کو لکھنے اور متشکل کرنے کا طریقہ ان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ "گھر" کا صحیح اور حکمیاتی تجزیہ 'گھ + ر' اور "بھر" کا 'بھ + ر' ہے اور ان کے ہجے 'گ ھ ر زبر گھر' نہیں بلکہ 'گھ زبر ر گھر' ہیں۔ صوتیوں پر بحث کرتے ہوئے مشہور فرانسیسی ماہر صوتیات دی ساسور نے یہ لکھ کر کہ:

"ان سلسلے میں ان صوتیوں کا ذکر نہ ہونا چاہیے جو مخلوط ہیں اور ان کی نوعیت خاص قسم کی ہے۔ جیسے: بھ، ڈھ وغیرہ ہائیے۔"[2]

ہائیہ آوازوں کو سرے سے فرانسیسی زبان کے نظام اصوات ہی سے خارج کر دیا ہے۔

یونانی حروف ابجد کی خصوصیات اور ان کی جامعیت کا ذکر کرتے ہوئے دی ساسور لکھتا ہے۔ قدیم یونانی میں ہائیہ آوازوں کو + O کی جگہ 'ہ'، اور وقفیہ کی ترکیب سے PH، TH، KH لکھا جاتا تھا جو ان کی نوعیت اور تالیفی مزاج کے پیش نظر صحیح ترین طرز تحریر ہے۔

ایک ہندی عالم مدن گوپال کا خیال ہے:

"سنسکرت کا چوں کہ یونانی سے واسطہ نہیں پڑا اس لئے انھیں کھ، گھ، بھ، جھ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، بھ الگ حروف بنانے پڑے۔"[3]

ان کے نزدیک صحیح اور معقول طریقۂ تحریر وہ ہے جو اردو اور رومن میں اختیار کیا گیا:

"رومن میں اور اردو میں 'ہ' کو اور حرفوں سے ملا کر کھ، گھ وغیرہ نئے حروف بنائے جاتے ہیں۔"[4]

ان نئے حروف کو مسٹر مدن گوپال کسی یورپی دماغ کا نتیجہ بتاتے ہیں:

"تیسری خوبی اردو رسم خط کی جو اور کسی ایشیائی حرفوں میں نہیں، یہ ہے کہ

---

[1] "نقوش" جولائی، ۱۹۶۲، (ص ۱۹)

[2] Course in General Linguistics ص ۴۳۔

[3] "زبان" ص ۳۰ ۔ [4] "زبان" ص ۳۶۔

اس میں دو حرفوں کو ملاکر دو آواز کے حرف بنائے جاتے ہیں۔ جیسے بھ، کھ وغیرہ۔ یہ تیسری خوبی کسی یورپی دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے[1]۔"

میں کہتا ہوں اردو انداز تحریر رومن سے زیادہ صحیح اور معقول ہے کہ رومن میں مثلاً KH کو "کھ" بھی پڑھ سکتے ہیں اور 'خ' بھی جب کہ اردو میں 'کھ'، کھ ہے اور 'خ'، خ۔

ایک اور اعتراض اردو حروف پر شد و مد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ذ، ض، ظ، ث، ص:

"یہ تمام حروف ہیں صوت نہیں۔ (یہ) اردو رسم خط کے لئے ایک طرح سے وبال جان بنے ہوئے ہیں۔ عربی، فارسی لسانی روایت کی دھاک ابھی تک اسی طرح قائم ہے کہ اصلاح کی تمام کوششوں کے باوجود ان سے چھٹکارا نہیں مل سکا ہے[2]۔"

کہا جاتا ہے کہ صوتی نقطہ نظر سے یہ مردہ لاشیں ہیں جنھیں اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے، صرف اس لئے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے[3]۔

ایک صاحب فرماتے ہیں:

"ص، ث، ط، ظ وغیرہ عربی میں واضح آوازیں بھی ہیں اور صوتیے بھی، لیکن ہند و پاک میں جب یہ ایک ہی آواز کی تکرار سے زیادہ نہیں تو انھیں صوتیہ تو درکنار صوت کا مرتبہ بھی نہیں دیا جاسکتا۔ پھر ان کے لئے علاحدہ تحریری علامات برقرار رکھنا کیا معنی؟ زبان کی اصل اور بنیادی شکل تقریر ہے نہ کہ تحریر۔ تحریر کا کام تقریر کو صحت کے ساتھ قلمبند کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ علم (جھنڈا) کو اگر 'الم' لکھا جائے تو اس سے زیادہ فرق نہ ہوگا جو 'بار' بہ معنی 'بوجھ' اور 'بار' بہ معنی 'پھل' میں ہوتا ہے۔"

اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو میں:

۱۔ ذ، ض، ظ، ز کے مختلف نام ہیں۔

۲۔ ص، ث، س کے دو روپ ہیں

۳۔ ط، ت کی اور ح، ہ کی ایک کتابی شکل ہے[4]۔"

---

[1] زبان، ص ۳۶۔ [2] اردو سے معلیٰ لسانیات نمبر ص ۱۱۵۔ [3] اردوئے معلیٰ لسانیات نمبر ص ۱۱۲۔ [4] نقوش جولائی ۱۹۶۲ء ص ۱۹

یہ اصحاب اردو کے متشابہ الصوت حروف کو صوتیے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اردو میں مثلاً ذ کی آواز ض، ظ، ز سے مختلف نہیں۔ ط، ت کی ہم آواز ہے اور ص، ث، س کی۔ میں سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں کہ صوتیے کے باب میں ملفظ کی یکسانی اور اختلاف کی کوئی قیمت نہیں[1]۔ دو ہم آواز حروف اگر زبان کے دو کلموں میں امتیاز کا باعث ہوں تو وہ دو مختلف صوتیے شمار ہوں گے۔ بش C اور K ریب قریب ہم آواز ہیں۔ مسٹر راس کہتے ہیں کہ یہ دو صوتیے ہو سکتے تھے لیکن انگریزی کے کوئی دو کلمے تنہا ان کی وجہ سے ممتاز نہیں ہوئے اس لئے انھیں صوتیوں کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ متشابہ الصوت حروف کی وجہ سے ذیل کے کلمات میں ہم فرق کرتے ہیں۔ پھر یہ صوت کیوں نہ ہوں؟

ذ۔ض : ذم (مذمت) ضم (ملانا)

ذ۔ظ : مُذل (ذلیل کرنے والا) مُظل (سایہ افگن)

ذ۔ز : ذاخر (ذخیرہ کرنے والا) زاخر (جوش زن)

ض۔ظ : مُضل (گمراہ کرنے والا) مظل (سایہ فگن)

ض۔ز : مضل ۔ مزِل (لغزش دینے والا)

ظ۔ز : ظاہر ۔ زاہر (روشن)

ع۔ا : علم (جھنڈا) الم (دکھ)

ث۔ص : ثواب ۔ صواب

ث۔س : ثانی ۔ سانی (بھیگی ہوئی کھلی اور چارے کی آمیزش)

ص۔س : اِصرار ۔ اسرار (راز)

ہ۔ح : ہال ۔ حال وغیرہ

یہ حروف متعدد عربی الفاظ میں جو اردو ادب میں دخیل الفاظ کے طور پر عموماً مستعمل ہیں امتیاز کا باعث بنے۔ الفاظ کے بہت سے جوڑوں میں ان حروف کی وجہ سے فرق کیا گیا۔ علم و الم مختلف المعنی الفاظ ہیں جن میں ع اور الف کے علاوہ تمام حروف (آوازیں) مشترک ہیں۔ ع

---

[1] "صوتیہ" کی اصطلاح خالص غیر صوتی ہے۔ مسٹر راس لکھتے ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ لسانیات کا تعلق اب انسانی آوازوں کی بجائے صوتیوں سے ہے۔ آوازوں سے اس وقت بحث کی جاتی ہے جب ہم کسی زبان کے صوتیوں سے واقف نہیں ہوتے۔" (ملاحظہ فرمایئے "Etymology" صفحہ

اور 'ا' نے ان دو کلموں میں فرق کیا جس طرح 'ر' اور 'ل' نے 'رال' اور 'لال' میں باہم فرق کیا تھا۔ اس لئے 'ر' اور 'ل' کی طرح 'ع' اور 'ا' جداجدا دو صوتیے ہونے چاہئیں۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ یہ آوازیں "اردو میں ایک آواز کی تکرار سے زیادہ نہیں" عوام نہ سہی کم سے کم خواص اور اہل علم جن کے تلفظ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان آوازوں میں فرق کرتے ہیں۔ عربی کی طرح شایستہ اردو میں بھی یہ آوازیں واضح ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا تلفظ یا طرز ادا (Phonation) دوسرے سے مختلف ہے۔ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک عام سامع ان آوازوں کا باہمی فرق محسوس نہیں کرتا اور اس کے پردۂ گوش پر ان آوازوں کے اثرات یعنی ضربات میں یکسانی پائی جاتی ہے لیکن جدید صوتیات میں جیسا کہ میں نے اوپر کہیں عرض کیا تنہا سماعی اثرات (Auditory impressions) کی کوئی قدر و قیمت نہیں، جب تک اس کے ساتھ تلفظ شریک نہ ہو۔ آوازوں کا لطیف اور نازک فرق سامعہ کی طاقت اور دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ C اور K کی آوازوں کا فرق سماع سے محسوس نہیں کیا جاتا اس کے باوجود مسٹر راس انھیں مختلف بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صدا بندی کا کوئی اچھا آلہ ہو تو سماع یعنی خارجی طور سے بھی ان میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں راس نے ایک نفسیاتی نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی ایک زبان کے بولنے والے عام طور سے ان آوازوں کا فرق جنھیں ان کی زبان میں صوتیوں کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی، کانوں سے محسوس نہیں کرتے۔ مثلاً Kingcup میں 'K' کی دو مختلف آوازوں کا فرق عام انگریزی بولنے والے کو محسوس نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان آوازوں نے انگریزی کلمات میں فرق نہیں کیا۔ کوئی دو بامعنی انگریزی کلمے ایسے نہیں جن میں 'K' کی ان دو آوازوں کے علاوہ باقی سب آوازیں یکساں ہوں۔

عربی کے متشابہ الصوت حروف کی حیثیت ہر چند انگریزی C اور K سے بہت مختلف ہے، انگریزی C اور K ایک صوتیہ ہے، عربی کی مذکورہ بالا آوازیں ایک سے زیادہ صوتیے ہیں لیکن ہندی الاصل زبانوں کی یہ اصلی آوازیں نہیں، عربی سے مستعار لی گئی ہیں اور صرف عربی الفاظ میں مستعمل ہیں۔ اس لئے ایک عام قائل اور سامع کو ان آوازوں کے باہمی فرق کا احساس نہیں ہوتا اور خالص ہندی اصل و نسل کے لوگ انھیں صوتیے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

اس مسئلے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ تلفظ اور سماع کی حد تک اگر اہل اردو ان

آوازوں میں فرق نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ کہاں ہوا کہ تحریری طور سے بھی ان میں فرق نہ کیا جائے اور اسرار (راز) اور اصرار (تاکید) دونوں کو 'س' سے 'اسرار' لکھا جائے۔ زبان افہام و تفہیم کا آلہ ہے۔ الفاظ مختلف آوازوں سے ترتیب پاتے ہیں اور جہاں آوازیں مختلف نہیں ہوتیں ان کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ شراب اور بارش میں آوازیں مشترک ہیں، ترتیب بدلی ہوئی ہے اور جہاں ترتیب میں فرق نہیں ہوتا وہاں کلمے کی کوئی ایک آواز بدل دی جاتی ہے۔ جیسے بال، تال، میل، مول، سات، سال وغیرہ۔ یہ عمل اس لیے کیا جاتا ہے کہ کلمے ایک دوسرے میں ضم ہونے نہ پائیں ایک دوسرے سے مختلف رہیں اور سننے والا ان کے باہمی فرق کا احساس کر سکے۔ اگر آوازوں میں اختلاف نہ ہو یا کلمے ایک نوع کی آوازوں سے ترتیب پائیں تو ان کا باہمی فرق محسوس نہ کیا جائے اور زبان کا جو مقصد ہے، یعنی افہام و تفہیم، وہ فوت ہو جائے۔

ایک زبان کی حد تک عموماً یوں ہی ہوتا ہے لیکن زبانیں ایک دوسرے سے استفادہ کرتی اور چراغ سے چراغ جلاتی ہیں۔ ایک زبان نے دوسری سے کچھ لیا نہیں کہ راہوں میں خم آیا۔ خود ایک زبان کا راستہ سیدھا اور ہموار ہے جس میں کسی قسم کا ایک پیچ نہیں۔ اردو نے جو الفاظ عربی سے مستعار لیے ان میں سے بیش تر متشابہ الصوت حروف اور متحد المخارج آوازوں کی ترکیب سے بنے ہیں۔ اہل اردو عموماً بولتے وقت ان آوازوں میں فرق نہیں کرتے اس لیے سننے والوں کو 'اسرار' و 'اصرار' یا 'علیم' و 'الیم' وغیرہ یکساں الفاظ کے سمجھنے اور ان کے معانی تک رسائی حاصل کرنے میں خاصی دقت پیش آتی ہے جو کبھی کبھی سیاق و سباق کی رہنمائی کے باوجود اشتباہ کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ دقت سننے کی حد تک ہے۔ اگر تقریر کی تقلید میں تحریری طور پر بھی ان آوازوں کی علامت یعنی حروف میں امتیاز برقرار نہ رکھا جائے تو دقت دہری ہو گی اور بار (بوجھ) اور بار (پھل) جیسے مرادفات کی تعداد بہت بڑھ جائے گی جو زبان کی مقصدیت کے منافی ہے۔

یہ رسم تحریر کا معنویاتی (Semantical) اور بصریاتی (Visuval) پہلو ہے جسے اس کے صوتیاتی پہلو سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ زبان الفاظ کا ڈھیر نہیں بامعنی کلیات کا ذخیرہ ہے۔ یہاں آوازوں کے بامعنی جوڑوں کو صحت کے ساتھ تحریر میں منتقل کیا جاتا ہے۔ صحت کا مطلب یہ نہیں کہ آوازوں کا عکس اتار لیا جائے؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ آوازوں کے بامعنی جوڑوں کو کس طرح متشکل کیا جائے کہ ان کے نقوش ذہنوں میں مرتسم ہو جائیں اور جب جوڑوں کا یہ مجموعہ یعنی الفاظ و کلیات ایک عام قاری کے سامنے آئیں تو وہ ان کی تہ

تک پہنچ جائے۔ ڈاکٹر ٹرینچ کے بقول لفظ کا آنکھ سے بھی قریب قریب وہی تعلق ہے جو کان سے ہے۔ اردو حروف ہجا پر اعتراض کرنے والے اہل علم شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اہل اردو نے ذ، ض وغیرہ متشابہ الصورت حروف براہ راست عربی سے لے کر اپنے حروف میں شامل کر لئے اور بامعنی جوڑوں کو تحریر میں منتقل کرتے وقت بعض الفاظ کو انھوں نے 'ذ' سے لکھا اور بعض کو 'ض' سے، بعضے لفظوں کو 'ظ' سے لکھا اور بعضوں کو 'س' یا 'ث' سے۔ جبھی تو وہ یہ کہتے ہیں کہ عربی کے یہ حروف "مردہ لاشیں ہیں جنھیں اردو رسم خط اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے"، یا جب ان حروف کی اردو میں کوئی خاص آواز نہیں تو ان کے لئے علاحدہ تحریری علامات رکھنا بے معنی ہے۔"

معترضین کا یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے۔ اہل اردو نے عربی سے حروف نہیں لئے، الفاظ و کلمات مستعار لئے ہیں۔ انھوں نے ان کلمات کو بطور خود ذ، ض وغیرہ حروف سے نہیں لکھا بلکہ عربی میں یہ کلمے ان ہی حروف سے لکھے جاتے تھے۔ اہل اردو نے ان کلمات کو جوں کا توں اپنے یہاں لے کر استعمال کرنا شروع کر دیا اور اپنی طرف سے ان میں کسی قسم کا تصرف روا نہیں رکھا۔ عربی کے یہ کلمات اردو کے تحت ہم یعنی مستعار (Loanwords) الفاظ ہیں جو اپنی موجودہ صورت میں اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ یہ زبان کے رائج اور چالو الفاظ ہیں اس لئے زندہ ہیں اور زندہ الفاظ کے اجزا زندہ ہوا کرتے ہیں۔ جب تک یہ الفاظ اردو میں رائج ہیں ان کے لئے علاحدہ تحریری علامات برقرار رکھنی ہوں گی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو عربی کے متشابہ الصورت حروف کا مسئلہ اردو میں صوتیاتی کم تعمیری یا تشکیلی زیادہ ہے۔ اردو نے صوتیوں (Phonemes) کو نہیں بلکہ صیغوں (Mor-phemes) کو عربی سے لیا ہے، ان کے ساتھ صوتیے بھی چلے آئے جیسے دودھ کے ساتھ مکھن جو اس کا جوہر ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوئی کہ اردو حروف ہجا بڑی حد تک جامع ہیں کہ ان میں اردو کے بیچ میل الفاظ جو سامی، آریائی اور دراوڑ جیسی مختلف الاصل زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ اردو کے مزاج کے مطابق آسانی سے متشکل کئے جا سکتے ہیں۔ مزاج کے مطابق متشکل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو نے جن آوازوں میں اپنی فطرت، مزاج یا روایت کے مطابق تصرف کر لیا ہے وہ بدلی ہوئی نئی شکل میں لکھی جاتی اور تحریر کے مطابق پڑھی جاتی ہے۔ مثلاً سنسکرت میں غنہ آوازیں پانچ ہیں۔ اردو میں دو ہیں۔ سنسکرت کی تمام غنہ آوازیں اردو میں (م کو چھوڑ کر)

'ن' ، ہو گئی ہیں جس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ظاہر (ابتدا، وسط اور آخر میں) جیسے چنا، کرن۔ دوسرا خفی (وسط اور آخر میں) جیسے بھینسا، گاؤں، سماں وغیرہ۔ اردو نے اپنے مزاج کے مطابق سنسکرت نڑ وغیرہ مغنونہ آوازوں کا تلفظ 'ن' کیا اور انھیں 'ن' سے لکھا۔ جیسے کرن (کرنڑ)، سونا (سورنڑ)، ابرن (ابھرنڑ)[1]

حروف ہجا کی عام طور سے دو قسمیں کی جاتی ہیں:

۱۔ مصوتہ (حرکات و علل) انھیں سنسکرت میں سور اور انگریزی میں (Vowels) کہتے ہیں۔

۲۔ مصمتہ (حروف صحیح) سنسکرت ونجن، انگریزی (Consonants)

پہلے مصمتوں کو لیجئے۔ ان کے لئے اردو کی صحیح اصطلاح حروف صحیح ہے۔ اس لئے کہ 'ے و' اور 'ے ے' (و اور ی لین) سنسکرت اور انگریزی اصلاح کے مطابق علتیں ہیں۔ فارسی میں (نیز عربی میں) یہ صحیح آوازیں ہیں۔

اردو حروف صحیح (باستثنائے ہائیہ) ۳۵ ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ خالص ہندی: ٹ، ڈ، ڑ۔

۲۔ خالص فارسی: ژ

۳۔ خالص عربی: ذ، ض، ط، ظ، ث، ص، ع، ح، ء۔

۴۔ مشترک: ب، پ، ت، ج، چ، خ، د، ر، ز، س، ش، ف، غ، ک، ق، گ، ل، م، ن، و، ہ، ی۔

ان میں سے ز، خ، ف، غ عربی اور فارسی میں مشترک ہیں، پ، چ، گ ہندی اور فارسی میں اور ق، عربی اور ترکی میں۔ باقی حروف ان تمام زبانوں میں ہے جن سے اردو نے استفادہ کیا۔

اس تفصیل سے اردو حروف صحیح کی جامعیت ثابت ہوتی ہے۔ اردو کی طرح جو ایک حیثیت سے کھچڑی زبان ہے، اس کے حروف بھی کھچڑی ہیں۔ چنانچہ اردو کی لفظی تعمیر میں حصہ لینے والی ہر زبان کا لفظ اپنی اصلی آواز کے ساتھ اردو تحریر میں متشکل کیا جا سکتا ہے۔ ان حروف کو

[1] بعض اہل علم بتاتے ہیں۔ م، ن، تیسری 'ن گ' جو منگل، ونگل میں ہے لیکن یہ صحیح نہیں اس لئے کہ "منگل" "ن" اگر 'ن گ' کا قائم مقام ہے تو اس کو "منگ گل" پڑھنا چاہیے۔

اس لحاظ سے بین قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ مثلاً "ژ" کو لیجئے۔ فارسی ژالہ باری، ژرف نگاہی، ژولیدہ بیانی، ژاژ خائی، شیر ژیاں اور مژہ ہائے دراز کے علاوہ یہ آواز انگریزی (Pleasure) اور فرانسیسی بورژوا میں بھی ہے یا مثلاً "ظ" کی آواز اطالوی میں ہے اور ث، ذ، ع، ء کی آوازیں یونانی میں ہیں۔ ڈاکٹر چٹرجی نے ہندی ہندوستانی کے لئے آج سے جو پورے ۲۲ سال پہلے رومن حروف (ورن مالا) تجویز کئے تھے ان میں موجودہ رومن حروف پر خاص خاص علامات لگا کر ان تمام آوازوں کو زندہ رکھا گیا تھا جنھیں آج کے بعض اہل علم مردہ لاشیں قرار دے کر دفن کر دینا چاہتے ہیں۔

زبان کی اصلی اور بنیادی آوازیں حروف صحیح ہیں، شاید اس لئے انھیں مصمت (ضم یم، سکون ص، فتح م) کہتے ہیں جس کے معنی ہیں ٹھوس، بھرا ہوا، جو اندر سے خالی نہ ہو۔ سنسکرت لفظ ویجن سے اس کی تائید ہوتی ہے جو "وی انج" بمعنی ظاہر کرنا سے مشتق ہے۔ سنسکرت ماہرین صوتیات کا بیان ہے کہ حروف صحیح کو ویجن اس لئے کہتے ہیں کہ وہ الفاظ کے معانی و مطالب کی توضیح کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ایکن لکھتے ہیں[۱] "یہ کہنا کہ معانی و مطالب کا اظہار حرکات و مدات (مصوتوں) کی جگہ صحیح یعنی مصمت آوازوں سے ہوتا ہے، کسی حد تک ان زبانوں کے باب میں درست ہے جن میں صرف تین بنیادی مصوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بنیادی مصوتے سامی اور آریائی زبانوں میں تین سے زیادہ نہ تھے۔ ہند یوربی میں a، e، o صرف تین مصوتے اصلی تھے اور I، U، دو فرعی ثانوی جو حروف علت Y (ی) اور W (و) سے وابستہ سمجھے جاتے تھے۔ اصلی مصوتوں کو ی، اور و، کے ساتھ ترکیب دیا جاتا تھا اور ثانوی مصوتے ممدود و مقصور دونوں طرح مستعمل تھے۔

عربوں نے سب سے پہلے مصوتوں میں فرق کیا اور حرکت و علت الگ الگ ان کی دو قسمیں ب۔ زیر (ـِ)، زبر (ـَ)، پیش (ـُ) تین حرکتیں ہیں۔ یہ اصلی اور اولین مصوتے ہیں علتیں ی حیثیت رکھتی ہیں کہ وہ ان سے متفرع ہوئی ہیں۔ یعنی حرکت کے اشباع و تمدید یا ایک نوع حرکات کی باہمی ترکیب سے بنی ہیں یہ تین ہیں "ا" (الف ساکن) جو ـَ یعنی فتح کے اشباع سے د میں آیا (ـَ + ـَ = ا) 'ی' (یائے معروف) یہ کسرے (ـِ) کے اشباع سے بنی (ـِ + ـِ = ی) 'و' (واؤ معروف) یہ ضمہ (ـُ) کی تمدید سے (ـُ + ـُ = و) حاصل ہوا۔ کہیں دو ف حرکتوں کی ترکیب سے۔ یہ دو ہیں۔ 'ـُ و' ضمہ و فتحہ کی ترکیب کا نتیجہ ہے اور 'ے'،

[۱] Phonetics in Ancient Indi ص ۱۸

کسرے و فتحے کی ترکیب کا ہے۔ ان علتوں کو اصطلاح میں 'مد' کہتے ہیں۔

علت کی تیسری قسم لین ہے۔ یہ بھی دو ہیں 'اَو' زبر اور 'و' کا مرکب ہے۔ 'ے' زبر اور 'ے' کا۔

یہاں حرکت و علت کا فرق واضح ہونا چاہئے۔ یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ زبان کی بنیادی آوازیں جن سے اظہار مافی الضمیر کا کام لیا جاتا ہے، صحیح یا مصمت آوازیں ہیں۔ یہ قائم بالذات ہیں حرکتیں قائم بالغیر ہیں۔ انھیں حرکت اس لئے کہتے ہیں کہ یہ صحیح آوازوں کو سلسلۂ صدا میں پرو کر حرکت میں لاتی ہیں۔ حرکات اور صحیح آوازوں کی مثال کپڑے اور رنگ کی سی ہے۔ کپڑا صحیح آواز کی طرح قائم بالذات ہے، حرکت رنگ کی طرح ہے۔ رنگ کپڑے کے ساتھ ہوتا ہے، اس سے جدا نہیں ہوتا حرکت صحیح آواز کے ساتھ رہتی ہے، اس سے الگ نہیں ہوتی۔ جب تک کپڑے کا کوئی رنگ نہ ہو کپڑا وجود میں نہیں آتا۔ صحیح آواز حرکت سے تکیف ہونے کے بعد سلسلۂ صدا میں جگہ پاتی ہے۔ کپڑا اپنے وجود میں رنگ کا محتاج ہے، اس کے باوجود وہ اپنی ذات سے قائم ہے۔ صحیح آواز اپنی ہستی میں حرکت کی محتاج ہونے کے باوصف مستقل وجود رکھتی ہے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ سلسلۂ صدا صحیح آوازوں سے ہے جس طرح لڑی موتی کے دانوں کو پرو کر ہار بناتی ہے حرکتیں صحیح آوازوں کو سلسلۂ صدا میں پرو کر آوازوں کا ایک مستمر سلسلہ وجود میں لاتی ہیں۔ آوازوں کا اخراج بہاؤ یا ادا حرکات کی وجہ سے ہے اور یہ امر شاید اردو جانے والوں کے لئے حیرت کا باعث ہو کہ سنسکرت زبان کے نحویوں اور مشہور قواعد داں پانینی کے شارحوں نے لکھا ہے سور (Vowel) کو اَکشر بھی کہتے ہیں جو 'ا' اور 'کشر' سے مرکب ہے اور اس کے لفظی معنی ہیں حرکت دینا۔ حرف صحیح کو متحرک کرنے یا حرکت میں لانے کی وجہ سے 'سور' کو 'اکشر' کہا گیا۔ ان عالموں کی رائے میں سور اجزائے کلام کے لئے مادے یا جوہر یعنی ست کی حیثیت رکھتا ہے کہ صحیح آوازوں کو جوڑ کر ان کے مختلف بامعنی کلمے اور الفاظ ڈھالتا ہے۔

محقق طوسی کا بیان ہے کہ انسان کی زبان سے جو کلمے ادا ہوتے ہیں ان کی مثال نقرات Beats کی ہے اور یہ امر موسیقی کے شعبۂ ایقاع (تال) میں ثابت ہو چکا ہے کہ مسلسل اور پے در پے نقرات کے درمیان سکنات ہوتے ہیں۔ متحرک حروف نقرات ہیں اور ساکت حروف سکنات۔

۱؎ معیار الاشعار ص۲۵۔

"حروف متحرک از ہر جنس کہ باشد بجائے نقرات باشد حروف ساکن بجائے سکنات"[1]

میں نے اوپر کی سطروں میں سلسلۂ صدا کی تقسیم کرتے ہوئے متحرک حروف کو ایک خانے میں رکھا تھا اور حرکت کو حرف سے الگ نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سماع کی حد تک حرکت حرف سے الگ نہیں۔ حرف و حرکت کے اجتماع سے پردۂ گوش پر ایک ضربِ یا نقرہ یعنی چوٹ سی لگتی محسوس ہوتی ہے۔ حرکت ہر چند ایک جداگانہ آواز ہے، متقدمین نے اسے ایک آواز تسلیم کیا تھا۔

"حرکت حرف بشابہ انضمام حرفے است باو"[2]

اور جدید علماء اسے ایک صوتیہ بتاتے ہیں لیکن سننے میں حرکت حرف سے الگ نہیں۔ وہ حرف کے ساتھ قائم اور اس کی ایک صفت ہے اور یہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ صوتیات میں سماعی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

"بحرف مصمت تنہا ابتدا نتواں کرد مگر بعد ازاں کہ حرف مصوت مقارن او شود۔
و مجموع را حرف متحرک خوانند"[3]

اردو میں حرکات کو زیر، زبر، پیش (فارسی) یا کسرہ، فتحہ، ضمہ (عربی) کہتے ہیں۔ ان سے ان کی ماہیت اور صوتیاتی حقیقت بر انگندہ نقاب ہوتی ہے اور اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ حرکات کا کوئی مخرج نہیں۔ حروف صحیح کے تلفظ میں مخارج (زبان، تالو، ہونٹ وغیرہ) کے باہم ٹکرانے اور متصادم ہونے کی وجہ سے ہوا رک گئی تھی۔ حرکات نے مخارج کو جدا کر کے آواز کو جاری کر دیا۔ حرکات کی وجہ سے ہوا سر سرا کر نکل جاتی ہے اور سلسلۂ صدا جاری رہتا ہے۔ اس لئے انھیں مصوت (آواز دہندہ) کہتے ہیں اور سنسکرت میں سور (سور = آواز دینا)[4]

جدید صوتیات میں سانس کا اجرا Explosion ہے اور اس کا انسداد Implosion ۔ ماہرین کا بیان ہے کہ حرف صحیح اور علت کا اجرا اور انسداد ہو سکتا ہے مثلاً Appa میں پہلی "P" تلفظ کرتے وقت مخارج مسدود ہو جاتے اور ہوا رک جاتی ہے اور دوسری "P" کا تلفظ کرتے ہی سانس جاری ہو جاتا ہے۔ حروف کی پہلی کیفیت سکون (Zero Vowel) ہے اور دوسری حرکت Aiia میں پہلی I مسدود ہے۔ دوسری جاری اور Auua میں

---

[1] معیار الاشعار ص۲۲ ۔ [2] معیار الاشعار ص۲۱ ۔ [3] معیار الاشعار ص۲۳

[4] Phonetics in Ancient India ص۲۹ حاشیہ ۔

پہلا U مسدود ہے، دوسرا مفتوح۔ ڈاکٹر سپاسور کہتا ہے کہ ان حرکات یا علل کی مسدود و
مفتوح یعنی جاری آوازیں ایک دوسرے سے اتنی مختلف اور متمائز ہیں کہ بعض تحریروں میں ان کے
لئے جدا جدا شکلیں رکھی گئی ہیں۔ انگریزی میں 'W'، یونانی میں I اور فرانسیسی میں Y جاری
آوازوں کے لئے ہیں اور U ، I مسدود آوازوں کے لئے۔

اردو اس باب میں بھی باقاعدہ ہے کہ اس میں حرفِ صحیح کی طرح علل کی بھی دو کیفیتیں
ہیں۔ 'ای' میں پہلی 'ی' ساکن ہے دوسری متحرک۔ اور 'او و' میں پہلا 'و' ساکن ہے اور دوسرا
متحرک۔ 'ا' ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اس لئے اس کی ایک ہی کیفیت ہے۔

ہندوستان اور مغرب کے اہلِ علم نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور صوتیاتی نازک موشگافیوں
کے باوجود قدیم بنیادی حرکات َ، ِ، ُ کو دیوناگری अ, इ, उ اور رومن U ،
A ، I سے ممتاز اور ممیز نہیں سمجھا اور دونوں کو واحد قرار دیا۔ اس لئے حرکات و علل کے بہت
سے مسئلے الجھ کر رہ گئے اور دیوناگری میں ہر سور کی (अ کو چھوڑ کر) ایک ماترا ہے۔ سور کلمے
کے ابتدا میں ہوتا ہے اور ماترا وسط یا آخر میں۔ رومن میں ہر 'داول' کی دو آوازیں ہیں۔ ابتدائی
داول کی آواز کلمے کے درمیانی یا آخری داول کی آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ AB میں 'A'
کی آواز اور ہے اور BAT کے 'A' کی آواز اور۔ پہلا 'A' ہمزہ وقفیہ اور َ کا مجموعہ اور
اردو 'اَ' کا مساوی ہے۔ دوسرا حرف َ یعنی فتحہ ہے اور 'B' کی ایک کیفیت ہے۔ یہی حال
I ، U وغیرہ کا ہے۔ یہ علتیں نہیں صحیح آوازوں اور حرکات کا مجموعہ ہیں اور اس کا سب سے
بڑا ثبوت یہ ہے کہ شروع کلمے میں ہوں تو یہ حلق یا حنجرہ سے ادا ہوں گے۔ وسط یا آخر میں ہوں تو ان
کو ادا کرنے کے لئے منہ میں ہوا کی سرسراہٹ اور ہونٹوں کی ایک خاص وضع گولائی ( ) پھیلاؤ
( ) یا انفتاح کافی ہے۔

اگرچہ قدیم و جدید ماہرینِ صوتیات نے جیسا کہ میں نے عرض کیا، دیوناگری اور رومن حروف
کے اثر سے حرکات و علل میں فرق نہیں کیا لیکن ان کے یہاں مجھے ایسے اشارے ملے ہیں جن سے
ان میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قدیم ہندی ماہرینِ صوتیات نے جہاں اس امر کی تصریح کی ہے
کہ अ (اَ) کا مخرج کنٹھ یعنی حلق ہے۔ (کنٹھیو اکارہ = اَ حلقی آواز ہے) وہاں یہ بھی لکھا ہے
کہ अ کا کوئی ستھان یا کرن نہیں۔ تمام سور अ کی طرح ہیں کہ مخارج کی مدد کے بغیر (کرنٹ
ابھاؤ) ادا کئے جاتے ہیں۔

'اَ' کا مخرج حلق ہے اور اس کا کوئی مخرج نہیں۔ سارا منھ اس کا مخرج ہے۔ (سرد
تکہ ستھانم اور رتنم) ان متضاد بیانات میں تطبیق کی صورت اس کے سوا کیا ہے کہ (اَ) کو فتحے اور
حلقی وقفیہ (ہمزہ) کا مرکب یا مجموعہ قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ اس کے ایک جز یعنی فتحہ کا کوئی
خاص مخرج نہیں اور دوسرے جز یعنی وقفیہ کا مخرج حلق ہے۔ ڈاکٹر ایلن لکھتے ہیں:

"صوتی طور سے یہ اس صورت میں صحیح اور با معنی ہے جب a کو مطلق یعنی
غیر مشروط قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ مختلف حرکات جن کو ادا کرتے وقت
زبان مختلف نہج سے اوپر کو اٹھتی ہے a کے اوپر وارد کر دی جاتی ہیں۔"

اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ اَ، اِ، اُ کے درمیان ایک مجرد، غیر مشروط یا مطلق
لیکن مشترک وقفیہ ہے جو سہ گانہ حرکات قبول کرنے کے بعد مشروط یا مقید ہو جاتا ہے۔ جدید
سمعیاتی صوتیات میں اس مطلق وقفیہ کو (Glottal Spectrum) کہتے ہیں۔

بہر حال A، U وغیرہ صوتیے حرکت اور حرف سے مرکب ہیں۔ ان کی صوتیاتی حیثیت
بَ BA اور تَ TA وغیرہ کی سی ہے۔ بَ ایک رکن یا جزو کلمہ (اکشر Syllable) ہے
اور حرف شفوی ب اور حرکت ــَـ کا مرکب ہے۔ اسی طرح A بھی ایک رکن ہے اور حرف حلقی اور
حرکت کی ترکیب کا نتیجہ ہے۔ حرکات اصلاً غیر قائم بالذات ہونے کے باعث مستقل نہیں، صحیح
آوازوں کی کیفیات ہیں اور صحیح آوازوں کے تلفظ کے ساتھ وجود میں آتی ہیں۔

دیوناگری اور رومن A، I، U کی جگہ اردو میں صرف ایک علامت (ا) ہے
جس پر تین حرکتیں وارد کر دی جاتی ہیں۔ یہ صوتیات کے مطابق ہے اور اس میں آسانی بھی
ہے۔

بہر حال بنیادی حرکتیں صرف تین ہیں، علتیں ان حرکتوں کی ترکیب و تالیف سے بنی
ہیں۔ اولین مرکب حرکات یعنی علل وہ ہیں جو ایک قسم کی حرکت کے اشباع یا تمدید سے وجود میں
آئیں۔ 'لا' کا 'ا'، 'بی' کی 'ی'، اور 'بو' کا 'و'، ہر چند ــَـ + ــَـ، ــِـ + ــِـ اور ــُـ + ــُـ
ہیں لیکن ان کے اجزا ایک نوع کی دو حرکتیں ہیں اس لئے یہ طریق تساہل ترکیب کی بجائے
ہم انھیں اشباع یا تمدید کی پیداوار بتاتے ہیں۔ یہ مصوتے ایک نوع کی دو حرکتوں سے بنے ہوں
یا ایک حرکت کے اشباع سے، سلسلۂ صدا میں سکنات میں قائم مقام ہونے کے باعث ان کی مستقل
حیثیت ہے اور حروف صحیح سے ممتاز طور پر سنے جانے کی وجہ سے سلسلۂ صدا کی تقسیم کے وقت وہ

الگ لکھے جاتے ہیں۔

'او'، 'اے' (مجہول) دوسرے درجے پر ہیں کہ ـَ + ـِ اور ـَ + ـُ سے وجود میں آئے۔ پانینی انھیں گن کہتا ہے اور 'اَو'، 'اَے'، (لین) تیسرے درجے پر ہیں۔ یہ ـَ + او اور ـَ + اے کا نتیجہ ہیں۔ پانینی نے انھیں وردھی (= اضافہ) کے نام سے موسوم کیا تھا۔

یہ علتیں حرکات وعلل (و، ی) کی تالیف کا نتیجہ ہیں اس لئے اردو میں انھیں ان کی فطرت کے مطابق تالیف کے ساتھ یعنی حرکات وعلل کو جوڑ کر لکھا جاتا ہے۔

یہاں ترکیب وتالیف کا فرق پیش نظر رہنا چاہئے۔ اِے اُو قدیم ہند یورپی علتیں ہیں جن کا ہند اور یورپ دونوں مقامات میں 'o'e' کی طرح تلفظ کیا جاتا ہے۔ یہ تالیف ہے۔ 'اے' کا تلفظ اردو میں انگریزی ey (They میں) اور سنسکرت ते (वात में) کے درمیان ہے۔ جیسے 'میں' (ضمیر واحد متکلم) ہے وغیرہ اور 'او' کا انگریزی o (Note میں) اور سنسکرت (चौर میں) کے درمیان۔ جیسے اور طور وغیرہ۔ یہ آوازیں اردو میں مولف ہیں۔ انھیں ہم جس طرح لکھتے ہیں اسی طرح پڑھتے بھی ہیں۔ لیکن رومن ai اور au کو طوال (آای، آاو) اور مولف (اَے، اَو) دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ رسم تحریر کا بہت بڑا عیب ہے۔

'مد' اور 'شد' کی اردو نظام اصوات وعلامات میں بڑی اہمیت ہے۔ مد کا مصوتوں میں وہی مقام ہے جو 'شد' کا مصمتوں میں ہے۔ 'مد' کے معنی ہیں دراز کرنا اور کھینچنا۔ 'آ' کے دراز کرنے سے الف پیدا ہوا۔ اردو تحریر میں دو الفوں کی جگہ مد (~) سے کام لیتے ہیں۔ جیسے آ (= اا) شد کے معنی ہیں سخت کرنا یا دہرانا۔ ایک جنس کے دو حرف صحیح کا ادغام شد ہے۔ اسے تشدید (ّ) سے ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے ابا، کتا۔ محض دو صحیح آوازوں کی کوئی شد نہیں۔ اس صورت میں دونوں حرف الگ الگ لکھے جائیں گے۔

'مد' کی صورت میں دو الف (پہلا متحرک دوسرا ساکن) اور 'شد' کی صورت میں دو حرف صحیح (پہلا ساکن دوسرا متحرک) یک جا ہی نہیں یک جان ہو جاتے ہیں۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ تشدید ایک طویل مصمتہ ہے۔ یہ درست نہیں اس لئے کہ مصمتے کو جو اصلاً ساکن ہے 'دراز' نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر فرتہ عربی حروف کی خصوصیات شمار کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رومن رسم خط کے

خلاف عربی تحریر میں جداگانہ حرکاتی علامات واصوات کی جگہ عروضی اشکال کا استعمال کیا جاتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

ضمہ، کسرہ، فتحہ (حرکات) سکون (عدم حرکت)، الف، و، ی (علل) تشدید اور ہمزہ۔ مد، کا ڈاکٹر زرتہ نے ذکر نہیں کیا۔

اردو صوتیے

"صوتیہ" انگریزی لفظ Phoneme کا ترجمہ ہے۔ یہ جدید اصطلاح ہے لیکن اتنی جدید بھی نہیں جتنی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر فرتھ کے خیال میں یہ اصطلاح صدا (Phone) کے مقابلے میں اس سے مختلف اور قطعی طور سے ممتاز مفہوم کے لئے ۱۸۷۹ء میں وضع ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ صدا یعنی آواز سے مختلف و ممتاز صوتیہ کا مفہوم کیا ہے؟ صوتیہ کسے کہتے ہیں۔ اہل علم نے صوتیہ کی تعریف کر کے اس کا مفہوم سمجھانے کی جو کوشش کی ہے وہ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ صوتیہ کی جامع مانع منطقی تعریف کی مدد سے اس کا مفہوم واضح نہیں کیا جا سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ صوتیہ کا تعلق انسانی آواز سے ہے۔ صوتیہ کے معنی ہیں صوت کی طرف منسوب اور اس سے متعلق۔ صوتیہ بے شبہ صوتی اکائی (Phonological unit) ہے جسے مزید اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا لیکن صوتیہ کے تصور کی بنا صوتی اکائی کی ماہیت یا اصلیت پر نہیں اس کے استعمال یا منصب Function پر ہے۔ الفاظ آوازوں سے ترکیب پاتے ہیں۔ آوازیں مختلف ہیں۔ الفاظ میں اختلاف یا تعدد مختلف آوازوں کی وجہ سے ہے۔ آوازوں میں کیا اختلاف ہے اور کس نوعیت کا اختلاف ہے؟ اس مسئلے کا تعلق صوت (آواز) سے ہے یا یوں کہئے اس علم وفن سے ہے جس کا موضوع صوت ہے اور جسے علم الاصوات (Phonetics) کہتے ہیں۔ مثلاً ب، پ اردو (اور بعض دوسری زبانوں) کی دو مختلف آوازیں ہیں۔ ان میں کس نوع کا اختلاف ہے۔ ذات میں ہے یا صفات میں؟ یہ علم الاصوات سے معلوم ہوگا۔

صوتیات ان آوازوں کے استعمال اور زبان کے کسی لفظ میں ان کی نشست اور منصب

کو دیکھ کر بتائے گی کہ یہ اردو کی دو مختلف اصلی اور بنیادی آوازیں ہیں یا فرعی اور غیر بنیادی آوازیں۔ اس مقصد کے لئے اس کے پاس ایک میزان ہے اور وہ ہے اختلاف معنی۔ اگر کسی لفظ کی صوتی اکائی بدلنے اور سے لفظ کے معنی بدل جائیں تو اس سے قطع نظر کہ وہ صوتی اکائی علم الاصوات کی رو سے کیا ہے وہ زبان کی بنیادی آواز یعنی صوتیہ شمار ہوگی اور اگر معنی نہ بدلیں تو اسے زبان کی فرعی یا ذیلی آواز کہا جائے گا۔ شلاً س، ز صوتی اعتبار سے بالکل مختلف آوازیں ہیں اور اردو، انگریزی جرمانی وغیرہ زبانوں میں انھیں مستقل صوتیہ کی حیثیت حاصل ہے لیکن ہسپانوی زبان میں ان آوازوں کی وجہ سے لفظ کے معنی نہیں بدلتے۔ اس لئے یہ دونوں آوازیں ہسپانوی میں ایک صوتیہ کی دو شاخیں ہیں۔ بسٹر بلوم فیلڈ نے صوتیہ کی شرح کرتے ہوئے اس امر کی صراحت کی ہے کہ صوتیہ چھوٹی سی چھوٹی صوتی وحدت (Smallest unit) ہے جس کی وجہ سے لفظ کے معنی بدلتے ہیں۔ فن کے دوسرے عالم بھی یہی کہتے ہیں۔ صوتیے کے باب میں تلفظ بالکل بے معنی چیز ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ زبان کی کس آواز کا تلفظ کیا ہے اور وہ تلفظ صحیح ہے یا غلط۔ یا کسی صوتیہ کو کوئی تلفظ دیا گیا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر جونز فرماتے ہیں :۔

"صوتیے زبان میں معنویاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک صوتیہ دوسرے صوتیہ کی جگہ لے سکتا ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ صوتیہ کے رد و بدل سے یعنی ایک صوتیے کی جگہ دوسرا صوتیہ رکھ کر لفظ کو بدل دیا جائے۔ صوتیہ کے رد و بدل سے خود لفظ بدل جاتا ہے۔" (فونیم ص۱۴)

دو مختلف آوازیں سننے میں کبھی مختلف معلوم نہیں ہوتیں جس کے مختلف اسباب ہیں۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ زبان کی کون سی آواز بنیادی آواز کی حیثیت رکھتی ہے سماعی تاثرات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ایک صحیح اور سچا اصول ہونا چاہئے۔ یہ اصول ڈاکٹر جونز نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

> "اگر یہ معلوم کرنا چاہیں کہ زبان کی کوئی دو آوازیں دو مختلف صوتیوں سے تعلق رکھتی ہیں یا نہیں تو زبان کے کوئی دو لفظ تلاش کر لئے جائیں جو محض ان آوازوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ اگر ایسے دو لفظ مل جائیں تو یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا کہ وہ دو آوازیں دو مختلف صوتیے ہیں۔"
>
> (فونیم ص ۳۹)

بعض اہل علم دیوناگری حروف کے زیر اثر ا، ع، ت، ط۔ س، ث، ص۔ ز، ذ، ض، ظ کے

بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ ان میں سے ا، س، ت اور ز صرف چار اردو کی بنیادی آوازیں ہیں' باقی محض علامات ہیں اور یہ ہمارے اردو رسم خط کی بوالعجبیوں کے سوا کچھ نہیں۔"

اس سلسلے میں یہ حضرات کبھی علم الاصوات (Phonetics) کا سہارا لے کر کہتے ہیں کہ س، ث، ص اور ذ، ز، ض، ظ میں اہل اردو کوئی فرق نہیں کرتے۔ اردو بولنے والے ث کا ص کی طرح تلفظ کرتے ہیں اور ز کا ذ یا ظ کی طرح۔ جب ان حروف کی آوازوں میں کوئی فرق نہیں تو پھر تحریر میں امتیاز رکھنے سے فائدہ؟ کبھی صوتیات کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ س، ث، ص میں سے صرف س صوتیہ (Phoneme) ہے اور ز، ذ، ض، ظ میں سے صرف 'ز' باقی آوازیں زائد اور بے مصرف ہیں۔

ہر چند عام اردو بولنے والے ا، ع/ت، ط/س، ث، ص/ز، ذ، ض، ظ کے تلفظ میں کوئی ایسا فرق نہیں کرتے جو سننے والے کو محسوس ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ حروف ایک دوسرے سے مختلف اور متمایز آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو لوگ علم الاصوات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں ان حروف میں بڑا فرق ہے۔ ان کے مخارج مختلف اور ان کی صفات جدا جدا ہیں۔ اس علم کا تقاضا ہے کہ ان حروف کی آوازوں کو سمجھ کر دوسروں کو سمجھایا جائے یا کم سے کم ادا کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ اجنبی زبانوں کی آوازوں کے بارے میں آج سے پہلے کیا جاتا تھا اور آج بھی کیا جا رہا ہے۔ آج سے پہلے مولوی صاحبان علم تجوید کی مدد سے قرآن کے ہر حرف کو صحیح طور سے ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پنڈت جی باقاعدہ ویدوں کے حروف کا صحیح اچارن (تلفظ) اپنے شاگردوں کو بتاتے تھے اور اس زمانے میں انگریزی وغیرہ زبانوں کے الفاظ کا صحیح تلفظ سکھانے کے لئے صوتی (Phonetical) اور ملفوظی (Pronouncing) ستت لکھے جا رہے ہیں۔ علم الاصوات کی مدد سے ہمیں بھی مذکورہ بالا عربی الاصل حروف کے مخارج وصفات بتا کر عام اردو بولنے والوں کو ان کے صحیح تلفظ کی مشق کرانی چاہئے۔ اس کے بجائے علم الاصوات کا حوالہ دے کر یہ کہنا کہ ان حروف میں ہم فرق نہیں کرتے، اس لئے انھیں ترک کر دیا جائے میرے نزدیک بالکل ایسا ہے کہ ہم کہیں بہت سے ادبی الفاظ عام لوگ نہیں جانتے لہذا یہ الفاظ زبان سے خارج کر دیتے جائیں۔ علم روشنی دیتا ہے ہم اس سے تاریکی حاصل کرتے ہیں۔ یہ امر افسوسناک ہے۔

رہا صوتیوں (Phonemes) کا مسئلہ سو اس باب میں کبھی کسی خاص جذبے کے ماتحت احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا۔ ایک طرف علم الاصوات (Phonetics) اور صوتیات

(Phonemics) میں خلط ملط کر کے کہا جاتا ہے کہ یہ علامتیں (س، ص، ث، ذ وغیرہ) چونکہ صوتی اعتبار سے ایک ہیں اور آپس میں متضاد نہیں، اس لئے انھیں فونیم کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ دوسری طرف فونیم (Phoneme) کے یہ معنی سمجھ کر کہ وہ بہر حال (Necessarily) اور ہر جگہ (Everywhere) یک صوتی سیاق (Phonetic-Context) میں واقع ہو سکتا ہے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ "اگر ثابت کو سابت یا صابت بولا جائے تو معنی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا یا اگر لفظ "سازہ" کو ساظ یا ساض کہا جائے تو بھی وہی معنی رہتے ہیں اور اس سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اردو میں ذ، ظ اور ض (ز) کی آواز کو اور ث اور ص (س) کی آواز کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف علامتیں ہیں۔"

صوت (Sound) اور صوتیہ (Phoneme) میں فرق ہے۔ صوتی اعتبار سے دو آوازوں والے حروف ایک صوتی سیاق میں واقع نہ ہوں تو انھیں دو مختلف صوتیے نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً جاپانی HANA (پھول) کا 'H' جاپانی Hito (نوع انسان) کے 'H' سے صوتی طور سے مختلف ہے۔ پہلے 'H' کی آواز انگریزی House) کے 'H' کے مشابہ ہے اور دوسرے 'H' کی جرمن 'Ch' کے۔ لیکن جاپانی زبان میں کوئی دو لفظ ایسے نہیں جن میں صرف اس H کے بدلنے سے ان کے معنی بدل جائیں اس لئے مسٹر راس (Etymology p. 24) کہتے ہیں کہ یہ دو آوازوں والا H جاپانی میں ایک صوتیہ (Phoneme) ہے۔

اس کے مقابلے میں صوتی اعتبار سے ملتی جلتی مشابہ آوازیں اگر زبان میں کسی ایک جگہ صوتی سیاق میں واقع ہو جائیں یعنی محض ان آوازوں کے بدلنے سے لفظ بدل جائے اور اس کے معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں تو یہ آوازیں مختلف دو صوتیے شمار ہوں گے اور انھیں زبان کی دو بنیادی آوازوں (Phoneme) کا درجہ دیا جائے گا۔

اس اصول کے پیش نظر ا/ع دو صوتیے ہوں گے کہ یہ ذیل کے الفاظ میں ایک صوتی سیاق میں واقع ہوئے ہیں :

الم	علم
داعی	دائی
ضیاع	ضیار
عام	آم

اسی طرح ہ / ح دو صوتیے ہیں۔ یہ ذیل کے الفاظ میں تفریق پیدا کرتے ہیں :

ہال — حال

نواہی — نواحی

اشباہ — اشباح

ت اور ط بھی دو صوتیے ہونے چاہئیں۔ یہ ذیل کے الفاظ کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں :

تابع — طابع

تائی — طائی

ذیل میں لفظی جوڑوں کے دو گروپ پیش کئے جا رہے ہیں :

(۱) ز۔ذ — مزلہ۔مذلہ

(۲) ز۔ض — زریر۔ضریر

(۳) ز۔ظ — زاہر۔ظاہر

زن۔ظن

(۴) ذ۔ض — ذم۔ضم

(۵) ذ۔ظ — نذر۔نظر

(۶) ذ۔ز — ذکی۔زکی

(۱) س۔ث — نسر۔نثر

(۲) س۔ص — سورت۔صورت

سفر۔صفر

(۳) ث۔ص — ثواب۔صواب

ز، ذ، ض، ظ کی باہمی ترکیب سے چھ شقیں بنتی تھیں اور س، ث، ص کی ترکیب سے تین۔ اس لئے پہلے گروپ میں چھے اور دوسرے گروپ میں تین جوڑے پیش کئے گئے۔

ذیل کے کلمات میں س، ث، ص تینوں ایک سیاق میں واقع ہوتے ہیں :

نسر۔نثر۔نصر۔

صوتیہ (Phoneme) کی صحیح تعریف اور شناخت پیش نظر ہو تو اس میں شبہ نہیں رہتا کہ عربی کے جملہ متشابہ الصوت حروف جو اردو میں مستعمل ہیں، مختلف صوتیے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی اہم ہے کہ اردو میں یہ حروف اور ان کی آوازیں عربی سے آئیں جہاں یہ مختلف صوتیے ہیں اردو میں بھی انھیں صوتیے ہی ہونا چاہیے، اس لئے کہ صوتیے کا مدار تلفظ پر نہیں، استعمال پر ہے اور ان حروف کا استعمال عربی اردو دونوں زبانوں میں یکساں ہے۔

"صوتیے" کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے علمائے صوتیات نے لکھا ہے کہ صوتیوں کی دریافت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو زبانیں لکھی نہیں جاتیں، صرف بولی جاتی ہیں، ان کو تحریر میں لاکر ان کی بنیادی آوازوں کے لئے علامات یعنی حروف وضع کئے جائیں۔ یہ اہل علم صوتیوں کی مدد سے ایک ترقی یافتہ تحریری زبان کے حروف کم کرنا چاہتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ زبان کی علامات و حروف پر بحث کرتے وقت صوتیات کے مقابلے میں بصریات کو سامنے رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ آوازوں کا تعلق سماعت سے ہے اور تحریر کا بصارت سے۔ مختلف آوازوں میں سن کر فرق کیا جاتا ہے اور مختلف حروف میں دیکھ کر سننے میں دو آوازیں اگر یکساں نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لکھتے وقت بھی ان میں فرق نہ کیا جائے۔ ذم اور ضم کے تلفظ میں ہم فرق نہیں کرتے، لکھنے میں فرق کرتے ہیں۔ اول کو 'ذ' سے لکھتے ہیں اور ثانی کو 'ض' سے۔ تحریر کی حد تک ان میں فرق برقرار رکھنا ایسا ہے جیسے بولنے کی حد تک "بال" اور "پال" کی 'ب' اور 'پ' کی آوازوں میں فرق قائم رکھنا۔ اگر 'ب' اور 'پ' کی آوازوں میں فرق نہ ہو تو سنتے وقت 'بال' اور 'پال' میں اشتباہ ہوگا۔ اسی طرح 'ذ' اور 'ض' میں فرق نہ کیا جائے تو لکھنے میں 'ذم' اور 'ضم' موجب اشتباہ ہوں گے۔[1]

"ز" اور "ژ" کی اردو میں مختلف آوازیں ہیں۔ اہل اردو 'ز' اور 'ژ' کے تلفظ میں فرق کرتے ہیں اور دو مختلف آوازیں لفظی جوڑوں کے فقدان کے باوجود زبان کی بنیادی آوازیں شمار ہوتی ہیں۔ مثلاً انگریزی 'H' اور (ن گ) کا ایک بھی لفظی جوڑا نہیں۔ اس کے باوجود یہ انگریزی زبان کے صوتیے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جونز کے حوالے سے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ فیصلہ کرنے

---

[1] ڈاکٹر جونز کو بھی اس سے اتفاق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس طرح ہم صوت (Homcphones) میں کم سے کم بصری طور پر فرق کیا جا سکتا ہے۔ (فونیم ۳۲۰)

کے لئے کہ کوئی آواز زبان کی بنیادی آواز ہے صرف ایک لفظی جوڑے کا مل جانا کافی ہے۔ جوڑوں کی کمی زیادتی یا ان کے استعمال کی قلت و کثرت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

ہائیہ (بھ، پھ وغیرہ) پر تفصیل سے بحث کر کے میں ثابت کر چکا ہوں کہ یہ مصمتہ اور "ہ" کی تالیف و ترکیب کا نتیجہ اور ایک طرح کی تالیفی (Qomplex) آوازیں ہیں۔ ڈاکٹر جونز نے مرکب آوازوں کی دو قسمیں کی ہیں۔ ان کا تعلق پہلی قسم سے ہے۔ (ملاحظہ فرمائیے فونیم ص ۴)۔ بعض اہل علم محض اس بنا پر کہ دیوناگری رسم الخط میں ان کی مفرد حیثیت تسلیم کی گئی ہے اور ان کے لئے الگ سے علامات ہیں، انھیں مفرد آوازیں قرار دیتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ "یہ آوازیں اعضائے صوت کی ایک ہی جنبش سے ادا ہوتی ہیں۔"

چاند، بُوند وغیرہ کلمات میں ان اور وں بھی عضو صوت کی ایک ہی جنبش سے ہم مخرج طور پر ادا ہوتے ہیں پھر انھیں مصوتہ اور ن وصلی کے مرکب ٹھہرانے کی وجہ؟ دراصل ہائیت (Aspiration) اور غنائیت (Nasalisation) دو کیفیتیں ہیں۔ اول الذکر کا تعلق مصموتوں سے ہے اور ثانی الذکر کا مصوتوں سے۔ مصمتہ ہائیہ (پھ، بھ) ہوگا یا وقفیہ (ب، پ) اور مصوتہ مغنونہ ہوگا (آں، وں) یا غیر مغنونہ (آ، او)۔ یہ دونوں کیفیتیں ہ (Aspirate) اور ن (Nasal) سے حاصل کی گئی ہیں اس لئے ہائیہ اور غنہ کو بہ ترتیب مصمتہ اور ہ اور مصوتہ اور ن کی ترکیب کا نتیجہ کہا جائے گا۔

اردو میں م، ن، ر، ڑ وغیرہ کے ساتھ بھی "ہ" کی آمیزش ہوتی ہے جیسے بڑھ، ننھا وغیرہ لیکن چوں کہ یہ آمیزش سنسکرت میں نہیں اور دیوناگری حروف میں ان کے لئے "الگ سے علامات" وضع نہیں ہوئیں، اس لئے یہ اہل علم ان میں اور سنسکرت ہائیوں میں فرق کر کے فرماتے ہیں کہ "وہاں انضمام کامل ہے اور یہاں جزوی"۔

"انضمام" دونوں میں یکساں ہے۔ جس طرح بھ میں "ہ" کی آواز مصمتے کے بعد "جڑواں حالت میں اور کسی حد تک پہلی آواز میں ضم" ہو گئی ہے، ٹھیک اسی طرح "نھ" میں "ہ" کی آواز "ن" کے ساتھ منضم یعنی ملی ہوئی ہے۔ آج تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو ان دونوں میں کسی قسم کا فرق و امتیاز دکھائے اور یہ بتائے کہ "بھ" میں انضمام کامل ہے اور "نھ" میں ناقص۔

اعرابی نظام

حروف آوازوں (صوتیوں) کی علامات اور ان کے نمائندے ہیں۔ انھیں ان آوازوں کی صحیح نمائندگی کرنی چاہئے اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ حروف کا نظام مکمل اور جامع ہو جس کے ذریعے سے زبان کی ہر آواز ٹھیک ٹھیک صحت کے ساتھ ادا کی جا سکے۔ حروف کے اس جامع نظام کو جس میں زبان کی نازک سے نازک آواز متشکل ہو کر سامنے آجائے اور آواز آواز میں کسی قسم کے خلط و اشتباہ کا امکان نہ رہے صوتیاتی املا (Phonetic Orthagraphy) کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ لسانیاتی طور پر وسیع (Linguistically Broad) اور لسانیاتی طور پر غیر وسیع (Narrow) ان میں سے پہلی قسم کا املا کسی قدر آسان اور مفید ہے کہ اس میں زبان کی ہر آواز (صوتیہ) ایک مخصوص حرف سے ادا کی جاتی ہے اور ہر حرف صرف ایک آواز کی قائم مقامی کرتا ہے۔

اردو املا وسیع تر طرز تحریر ہے۔ اس میں ایک آواز کے لئے صرف ایک حرف اور ایک حرف کی صرف ایک آواز ہے۔ ایک طرف ہر بنیادی آواز کی اردو تحریر میں ایک مخصوص علامت ہے جو اپنی آواز کو ظاہر کرتی ہے، دوسری طرف فرعی یا ضمنی آوازیں جو کسی ایک بنیادی آواز کے تحت آتی ہیں جدا جدا حرفوں کی جگہ تنہا ایک حرف سے، جو بنیادی آواز کے لئے مخصوص ہے، ادا کی جاتی ہیں۔ مثلاً اردو کے سادہ مصوتوں یعنی حرکات کو لیجئے۔ زیر، زبر، پیش اردو کی تین بنیادی حرکات ہیں جن میں سے ہر ایک کی ایک تحتی شکل بھی ہے۔ "اعتماد" کے الف (نیز "ت") کا زیر، "احمد" کے الف کا زبر اور "مہرہ" کے میم کا پیش بہ ترتیب "اِس" کے الف کے زیر، "اَمر" کے الف کے زبر "استاد" کے الف کے پیش سے مختلف ہے۔ پہلی تین حرکتیں بعد کی تین حرکتوں کی ضمنی، فرعی یا تحتی

شکلیں ہیں جنھیں "اے" (یائے مجہول) "اے" (یائے لین) اور "او" (واو مجہول) کی ترشی ہوئی اور خفیف شکلیں ہونے کے باعث کسرۂ خفیف، فتحۂ خفیف اور ضمۂ خفیف کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔[1] اردو میں زیر، زبر، پیش کے لئے علامات رکھی گئی ہیں۔ ان ضمنی شکلوں کی کوئی علامت نہیں۔ انھیں زیر، زبر، پیش ہی کی مدد سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

بظاہر اسے اردو املا کی خامی اور کوتاہی کہا جائے گا کہ زیر، زبر، پیش اور ان کی خفیف ضمنی آوازوں کو ایک ہی علامت (شکل) سے ظاہر کیا جائے لیکن درحقیقت یہ اردو املا کی سہولت اور افادیت کی دلیل ہے۔ اگر ضمنی آوازوں کے لئے بھی علامات رکھی جاتیں تو اردو کا ابجدی نظام الجھ کر رہ جاتا اور قاری کے لئے اس کا یاد رکھنا دوبھر ہو جاتا۔

ضمنی آوازوں کے لئے جداگانہ علامتیں مقرر کرنے کی جگہ یہ بہتر سمجھا گیا کہ قاری کو بتا دیا جائے کہ مثلاً "ح" یا "ہ" (ساکن) سے پہلے کا فتحہ اردو میں خفیف ہے اور اس کا "ے" (لین) کی طرح تلفظ کیا جانا چاہئے۔ مشہور ماہر صوتیات ڈاکٹر جونز کہتے ہیں کہ ضمنی آواز کے لئے کوئی خاص علامت رکھنا مشکل ہے۔ یہ زیادہ آسان ہے کہ قاری کو قاعدہ بتا دیا جائے جس کی مدد سے وہ حسب ضرورت بنیادی اور ضمنی آواز میں فرق کر لیا کرے۔

فارسی یا عربی لفظ کی جب دوسرے لفظ کی طرف فارسی قاعدے کے مطابق (بطور اضافت یا صفت) نسبت کی جاتی ہے تو اس کے آخر میں ایک کسرہ (زیر) آتا ہے جیسے رفعِ شر، روزِ قیامت، حسنِ یوسف وغیرہ۔ یہ کسرہ خفیف ہے جو "ے" (مجہول) کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فارسی کے جو الفاظ "ا" یا "و" پر ختم ہوئے ہیں اور ساکن الآخر ہونے کی وجہ سے ان پر کسرہ نہیں آ سکتا اضافت ظاہر کرنے کے لئے کسرے کی جگہ ان کے آخر میں "ے" لاتے ہیں۔ جیسے آشنائے قدیم، گیسوئے سیاہ وغیرہ۔ ان کلموں کے آخر کی "ے" کسرۂ اضافت کی قائم مقام ہے اور کسرے کی آواز کو ظاہر کرتی ہے اس لئے "ے" پر ہمزہ بے محل ہے۔ مرزا غالب فارسی لفظ کے آخر کی "ے" پر (جس سے پہلے "ا" یا "و" ہو) ہمزہ لکھنے سے منع کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ عقل کو گالی دینا ہے۔

عقل کو گالی دینا اس لئے کہ اردو املا صوتی اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کا ہر قاعدہ زبان کے مزاج کو دیکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ فارسی الفاظ کے آخر کی "ے" کسرہ اضافت کا حق ادا کر دیتی

---

[1] انھیں کسرۂ مجہول، ضمۂ مجہول اور فتحۂ لین بھی کہہ سکتے ہیں۔

تھی اس لئے اسے ہمزہ سے بدل کر مکسور کرنا یا خود اس پہ کسرہ دینا عقل کے خلاف ہوا۔ یہاں اس کی وضاحت ہو جانی چاہئے کہ فارسی کے جن کلمات کے آخر کی "ے" اصلی ہے لیکن عموماً روپوش رہتی ہے۔ جیسے، خدا (ی)، جا (ے)، پا (ے)، بو (ے)، دو (ے) جب یہ کلمے مضاف ہوں گے تو ان کی "ے" ظاہر ہو جائے گی۔ جیسے خدائے توانا، جائے پناہ، پائے سخت، بوئے گل، روئے نیاز، وغیرہ۔ غالب کہتے ہیں کہ ان کلمات کے آخر کی "ے" پر بھی ہمزہ اور زیر نہ لکھو۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کی "ے" پہلے روپوش تھی، اضافت کے بعد ظاہر ہوئی۔ وہ گویا اضافت کی "ے" ہے اور کسرے کی قائم مقام ہے۔ اس پر کسرہ دینے سے فائدہ؟ رہا ہمزہ سو اس کا یہاں کیا موقع ہے۔

البتہ جب کلمہ مضاف کے آخر میں ہائے مختفی ہو جیسے جامہ، روزہ وغیرہ تو اضافت کی صورت میں "ہ" پر ہمزہ دے کہ اس طرح لکھیں گے جامۂ ابریشم، روزۂ رمضان۔ ہمزہ اور "ہ" متحد المخرج ہیں کہ دونوں حلقوم میں پیدا ہوتے اور درِ صوت سے ادا کئے جاتے ہیں۔ جب ان کلموں کی دوسرے کلموں کی طرف اضافت ہوئی اور ہائے مختفی میں کسرہ قبول کرنے کی صلاحیت نہ تھی تو "ہ" کو مجبوراً ہمزہ کا روپ اختیار کر کے زیر کا بار اٹھانا پڑا اور یہ رد و بدل عارضی تھا اس لئے "ہ" کو برقرار رکھ کر اس پر ہمزہ بنایا گیا۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ان کلمات میں ہائے مختفی کے اوپر جو ہمزہ لکھا گیا ہے وہ ہمزہ نہیں یائے تحتانی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمزہ کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ بعینہٖ نصف بالائی حصہ "ی" کا ہے بلکہ کامل "ی" ہے۔ یہ خیال بھی غالب کے لفظوں میں ایک طرح سے عقل کو گالی دینا ہے۔ "نامہ" اور "خامہ" وغیرہ الفاظ کی ہائے مختفی کا ہمزہ صوتی اور لسانی کسی لحاظ سے بھی یائے تحتانی نہیں ہو سکتا۔ صوتی لحاظ سے اس لئے کہ "جامۂ تو" جیسی مثالوں میں صاف صاف ہمزہ کی آواز ادا ہوتی اور سنی جاتی ہے۔ لسانی اعتبار سے اس لئے کہ "ہ" ہمزہ کی ہم صوت ہے تاریخ میں برابر ہمزہ کا روپ اختیار کرتی رہی ہے۔ اس لئے اسے ہمزہ ہی ہونا چاہئے۔

اس سلسلے میں ایک اور بڑی گالی بھی عقل کو دی جا رہی ہے۔ خاصے اچھے پڑھے لکھے بزرگ اس میں شریک ہیں اس لئے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ غالب نے الف واو پر ختم ہونے والے فارسی الفاظ کے بارے میں لکھا تھا کہ مضاف ہونے کی صورت میں ان کے آخر کی "ے" پر ہمزہ نہ لکھا جائے۔ ان بزرگوں نے عربی کے ان الفاظ کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا جن کے آخر میں "اء" تھا لیکن اہل اردو کے تلفظ میں ہمزہ گر جانے کی وجہ سے آخر کا حرف الف بچ رہا تھا۔ جیسے وفا (ء) ارتقا

(ء) ابناء (ء)، شعراء (ء) وغیرہ۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ جب عربی کے ان کلموں کی فارسی قاعدے کے مطابق اضافت کی جائے تو فارسی کلموں کی طرح ان کے آخر میں "ے" لکھی جائے ہمزہ نہ لکھا جائے چنانچہ ابنائے جنس کو یہ صحیح بتاتے ہیں اور ابناء جنس کو غلط۔ ارتقائے حیات ان کے نزدیک ٹھیک ہے اور ارتقاء حیات غلط۔

میرے خیال میں یہ اصول کے خلاف ہے۔ عربی کے الفاظ جن کے آخر میں "ء" ہے جب تنہا بغیر اضافت استعمال ہوتے ہیں تو ان کا ہمزہ روپوش ہو جاتا ہے لیکن جب ان کی دوسرے کلمے کی طرف اضافت ہوتی ہے تو خو، بو، رو وغیرہ فارسی الفاظ کے آخر کی "ے" کی طرح یہ ہمزہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اضافت فارسی قاعدے کے مطابق ہو یا عربی قاعدے کے، دونوں صورتوں میں ہمزہ بولا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہمزہ تلفظ میں آتا اور بولا جاتا ہے تو اسے لکھا کیوں نہ جائے؟ اور جب اس میں اضافت کا کسرہ قبول کرنے کی صلاحیت ہے تو اصول کے خلاف "ے" لکھ کر اس کی صورت مسخ کرنے سے فائدہ؟ خو، بو، وغیرہ فارسی الفاظ کے آخر کی روپوش "ے" اضافت کے بعد برافگندہ نقاب ہو سکتی تھی تو وفا، ارتقا، ابنا وغیرہ عربی الفاظ کے آخر کے ہمزہ نے کیا قصور کیا ہے کہ اضافت کے بعد وہ "انا الہمزہ" کا نعرہ بلند نہ کرے اور مضاف ہونے کی صورت میں ابناء نہ لکھا جائے۔ یہ املا صوتیات کے مطابق بھی ہے اور قواعد کے مطابق بھی۔ صوتیات کے مطابق اس لئے کہ ابناء جنس وغیرہ ترکیبوں میں ہمزہ مکسور کی آواز ہم سنتے ہیں۔ قواعد کے مطابق اس لئے کہ "ابناء" وغیرہ کلمے اصلاً ہمزہ پر ختم ہوتے ہیں۔ جس طرح خو، بو وغیرہ کلمے "ے" پر ختم ہوتے تھے۔ اس لئے اگر خو، بو وغیرہ کے آخر میں اضافت کے بعد "ے" لکھی جاتی ہے تو "ابنا" وغیرہ کلموں کے آخر میں ہمزہ لکھا جانا چاہئے۔

کسرۂ اضافت کے سلسلے میں ایک اور بات بھی توجہ کے قابل ہے وہ یہ کہ جن فارسی کلمات کے آخر میں یائے مجہول ہے جیسے پے، ے، کے وغیرہ مضاف ہونے کی صورت میں قاعدے کے مطابق ان پر کسرۂ اضافت آنا چاہئے لیکن "ے" چونکہ کسرۂ اضافت کی نیابت کر لیتی ہے اس لئے اس پر کسرے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یائے معروف اصلی پر کسرہ ضرور آنا چاہئے۔ جیسے:

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

اس لئے کہ زندگی کی "ی" میں کسرۂ اضافت کی قائم مقامی کی صلاحیت نہیں۔ اساتذہ، جاذبہ، داعیہ وغیرہ الفاظ کی "ہ"، فارسی جامہ، نامہ، وغیرہ کلمات کی "ہ" کی طرح ہے۔ اضافت میں ان

کے ساتھ ہائے مختفی کا سا سلوک کیا جائے اور ان کی "ہ" پر ہمزہ لکھا جائے۔

اس کے بعد خالص اردو الفاظ کا سوال سامنے آتا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ اردو الفاظ کے آخر میں "ا" ہوتا ہے "ہ" نہیں ہوتی۔ اس لئے ان الفاظ میں "ہ" نہ لکھی جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اردو الفاظ کے آخر میں بھی "ہ" ہوتی ہے اور یہ دو طرح کی ہے۔ اصلی جیسے گیارہ سے اٹھارہ تک کے اعداد میں اور وصلی جیسے ودیالیہ، اوشدھالیہ وغیرہ سنسکرت تت سم الفاظ میں۔ لیکن میں سنسکرت تت سم الفاظ کو "ے" سے لکھتا ہوں جیسے ودیالے، اوشدھالے یہ املا زیادہ صحیح ہے۔

"چھ" اور "پہ" میں بھی "ہ" ہے۔ "پہ" کی دو شکلیں ہیں۔ ایک "پر" کی جگہ اور اس کے معنوں میں۔ اس کا اہل دہلی کسرہ خفیف سے تلفظ کرتے ہیں۔ دوسری "مگر" کی جگہ اور اس کے معنوں میں۔ اس کا فتحہ سے تلفظ کیا جاتا ہے۔ غالب کا مصرعہ ہے؂

علم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل

"پہ" "کر" "ہ" سے لکھتے ہیں "چھ" کو بھی "ہ" سے لکھا جائے۔ اس کی "ہ" اصلی ہے۔ اہل دہلی اردو کے عام مزاج کے مطابق فتحہ خفیف سے جو اس کا تلفظ کرتے ہیں وہ اس "ہ" کی وجہ سے ہے۔ (مشرقی یو۔پی۔ میں چھ، پہ کے وزن پر مفتوح ہے)۔

اردو اور فارسی آریائی خاندان کی زبانیں ہیں اور عربی سامی خاندان کی۔ فارسی اردو کا مزاج عربی زبان کے مزاج سے مختلف ہے۔ ان پر عربی قاعدے نہ منڈھے جائیں۔ عربی کے ان قواعد پر قیاس کر کے ہمارے بعض عالموں نے لکھا تھا کہ "ا" اور "و" پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخری یائے وقایہ کسرے کے بچاؤ کے لئے لائی گئی ہے۔ ان عالموں کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی خدائی، بڑائی، وفاؤں وغیرہ کلموں کے ہمزہ کو ہمزہ وقایہ کہنے لگے۔ یہ زبان کی تاریخ سے ناواقفیت ہے۔ آریائی زبانوں میں یائے وقایہ ہے اور نہ ہمزہ وقایہ۔ "خدا" اصل میں "خدائے" تھا۔ ہمزہ "ے" کا بدل ہے۔ "بڑائی" کی "ئی" ہمزہ اور ی کی ترکیب کا نتیجہ نہیں بلکہ "-ائی" ایک آزاد اور مستقل لاحقہ ہے جس کا ذکر علماء لسانیات نے کیا ہے۔ یہی حال "وفاؤں" کے ہمزہ سے ہے۔ ـ وں لاحقہ جمع ہے۔ یہ مردوں اور عورتوں وغیرہ میں بھی ہے۔ اس طور پر مرد + ـ وں = مردوں۔ عورت + ـ وں = عورتوں وغیرہ وغیرہ۔

جو کلمے کسی حرف صحیح ساکن پر ختم ہوتے ہیں لاحقہ ـ وں اضافہ کرنے پر ان کا آخری حرف مضموم ہو جاتا ہے۔ "ا" پر ختم ہونے والے کلموں پر پورا لاحقہ ـ وں بڑھایا گیا۔ اس لئے کہ "ا" میں حرکت قبول کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ "و" البتہ حرکت قبول کرتا ہے۔ اس لئے بھو اور ہندو

وغیرہ کلموں کی جمع بچھوؤں اور ہندوؤں ("و" کے ساتھ ہوگی) لیکن "و" پر ضمہ اور کسرہ اردو زبان کے مزاج کو سازگار نہ تھا۔ زبانوں پر ذرا اولر سا محسوس ہوتا تھا اس لئے بچھو وغیرہ کلمات کا "و" ہمزہ سے بدل کر اردو والے "بچھوؤں" کو "بچھوئں"، "ہندوؤں" کو "ہندوئں" کہتے ہیں۔ ہمزہ "و" کا بدل ہے اس لئے "و" کو گرا تے نہیں باقی رکھتے ہیں اور اس پر ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ "ہوا" (ہونا سے فعل ماضی صیغہ واحد مذکر) کی تانیث قاعدے کے مطابق "ہوی" اور جمع "ہوے" ("و" کے ساتھ) ہونی چاہئے لیکن فصحا اردو کسرے کی وجہ سے "و" کو ہمزہ سے بدل کر "ہوئی" اور "ہوئے" کہتے ہیں۔

"چھوئی موئی" تانیث ہے "چھوا موا" کی۔ یہ ایک پودے کا نام ہے۔ قاعدے سے اسے بھی "چھوی موی" ہونا چاہئے لیکن ہم سب ہمزہ لکھتے اور "و" کی جگہ ہمزہ کا تلفظ کرکے "چھوئی موئی" کہتے ہیں۔ ناسخ کے عہد تک آنا، جانا، پانا وغیرہ افعال کا مضارع آوے، جاوے، پاوے زبانوں پر تھا۔ اس کے بعد "و" پر کسرے کے ثقل کا احساس ہوا تو فصحا نے "و" کو ہمزہ سے بدل کر آئے جائے پائے کہنا شروع کیا۔ لیکن آوے بھی چالو رہا:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

آئے، جائے کی ایک مخفف شکل آے جاے (بغیر ہمزہ) بھی ہے۔ جیسے:

آے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ "آے" کی جمع "آئیں" ہوگی اور "آے" کی "آیں" (بغیر ہمزہ) انشا ہمزہ مکسور اور ن غنہ بغیر لکھتے ہیں۔¹ یہ درست نہیں۔ اس لئے کہ "آیں" جمع ہے "آے" کی جس میں "ے" سے ہمزہ نہیں۔ جمع میں ہمزہ کہاں سے آیا اور کیسے؟

"ے" پر بھی کسرہ ناگوار سمجھا جاتا ہے لیکن اس صورت میں جب "ے" سے پہلے فتحہ ہو۔ گیا کی جمع گئے ہوگی اس لئے کہ "ی" سے پہلے "گ" پر فتحہ ہے اور کیا، لیا، دیا، پیا، جیا وغیرہ کلموں میں "ی" سے پہلے کسرہ ہے اس لئے ان کی جمع میں "ی" باقی رکھ کر لیے، دیے، پیے، کیے، جیے کہیں گے۔

دیجیے، لیجیے، بیٹھیے، اٹھیے، کہئے وغیرہ افعال جن میں "ے" سے پہلے کا حرف مکسور ہے

---

¹ جائے با ہمزہ مسکور و نون غنہ بغیر یا و حق نیز مستعمل فصحا باشد۔ (دریائے لطافت ص ۱۰۹)

"ے" سے لکھے جائیں گے۔ چاہیے، آئیے، جائیے، لگائیے، پائیے وغیرہ کلمات میں بھی "ے" سے پہلے زیر ہے انھیں بھی "ے" سے لکھا جائے۔ اس باب میں بھی انشا سے سہو ہوا ہے[1]۔ اصل یہ ہے کہ ہمزہ اس وقت آئے گا جب اس سے پہلے زیر ہو۔ اگر ماقبل زیر ہے تو "ے" آئے گی۔ یہ کلیہ قاعدہ ہے۔

---

[1] انشا نے (دریائے لطافت ص ۱۰۲) لئے وغیرہ الفاظ کو اس طرح ضبط کیا ہے:

باہمزہ و یا و حق یکے ہم بعد از امر مفرد حاضر جمع تثنیہ حاصل آید مانند اٹھیئے بجائے برخیزید و بیٹھئے بجائے بنشینید۔

ہائیہ آوازیں

اردو میں ہائیہ اصوات و علامات (حروف) سترہ ہیں جن میں سے دس قدیم ہیں اور وہ یہ ہیں :۔

کھ، گھ، چھ، جھ، ٹھ، ڈھ، تھ، دھ، پھ، بھ۔

ذیل کی سات آوازیں بعد کی پیداوار ہیں :۔

رھ، ڑھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ مفرد (بسیط) آوازیں ہیں اور لسانیاتی اعتبار سے انھیں مستقل صوتیہ (Phoneme) کی حیثیت حاصل ہے۔ اس خیال کا اظہار سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں اطیش چندر سین نے کیا (ملاحظہ فرمائیے صوتی علوم کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس لندن کی روداد) آج عام طور سے اہل علم یہ فرما رہے ہیں :۔

"گھر، بھر، جھڑ وغیرہ الفاظ میں گھ کو 'گ' اور 'ہ' بھ کو 'ب' اور 'ہ'، جھ کو 'ج' اور 'ہ'، سے مرکب آوازیں سمجھا جاتا ہے حالانکہ صوتی نقطۂ نظر سے یہ مفرد آوازیں ہیں نہ کہ مرکب"

(اردو معلی، لسانیات نمبر ص ۱۱۱)

اردو کے جو عالم کل تک ان آوازوں کو مخلوط مانتے تھے اب یہ کہتے ہیں :۔

"میری دانست میں بھ، پھ، تھ، ٹھ، دھ وغیرہ میں ب، پ، ت، ٹ، د اور ہ اپنی اپنی اصل کو ایک حد تک کھو کر ایک نئی آواز اور نیا مخرج پیدا کرتے ہیں"

(نوائے ادب، اکتوبر ۶۲ء)

میں اسے ناگری تحریر اور اس سے ماخوذ خطوط کا اثر سمجھتا ہوں اور اس کا ایک واضح اور

قرین قیاس قرینہ ان میں سے بعض اہل علم کا قدیم و جدید ہائیوں میں فرق کرنا ہے۔ یہ حضرات سنسکرت کے قدیم ہائیوں کو جن کی دیو ناگری میں مستقل اور آزاد شکلیں ہیں مفرد آواز بتاتے ہیں۔ بقیہ کی ناگری میں کوئی خاص شکل نہیں۔ یہ ان کے نزدیک "مرکب اور مخلوط" ہیں :-

"اردو میں منفوس[1] (Aspirates) آوازوں کو مفرد آواز کا درجہ دیا جا سکتا ہے کیوں کہ ان میں "ہ" اس طرح شیر و شکر ہو گئی ہے کہ پوری آواز ایک ہی کوشش اور ایک ہی جھٹکے میں ادا ہوتی ہے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں :-

"ان کے علاوہ دوسری آوازوں کے بارے میں ایسا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا مثلاً ذیل کی آوازیں در اصل مرکب اور مخلوط آوازیں ہیں۔ نھ (انھیں)، لھ (کولھو) رھ (سرھانے)، ڑھ (چڑھائی) —— یہ سب دو آوازوں کا مجموعہ ہیں۔"

(نقوش، جولائی، ۶۲ء ص ۲۰۔۱۹)

ہائیہ آوازوں کا صوتیاتی تجزیہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے ان کے بارے میں متقدمین نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک مختصر سا جائزہ لے لیں۔ قدیم ہندوستان کے ماہرین صوتیات کا خیال تھا کہ کھ، گھ وغیرہ اصلاً وقفیہ (سپرش) آوازیں ہیں جو سانس (پران اشمن) کے شدید اخراج کے ساتھ ادا ہوتی ہیں۔ انھیں مہاپران اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے تلفظ کے وقت سینے سے شدت کے ساتھ سانس باہر آتا ہے۔ (Phonetic in Ancient India ص ۳۸)۔ قدیم یونانی ان آوازوں کو "ہ" اور وقفیہ سے مرکب سمجھتے تھے۔ فرانس کے مشہور لغوی اور ماہر لسانیات فردیناند دی ساسور (ملاحظہ فرمائیے Course in General Linguistics ص ۳۹ حاشیہ) کا بیان ہے کہ کھ، تھ، پھ کو یونان کے قدیم ترین کتبوں میں PH TH KH لکھا

---

[1] سنسکرت مہاپران اور انگریزی (Aspirate) اردو میں اس کے حسب ذیل ترجمے کئے گئے ہیں :-

ہکار (ہاکار)، ہکاری (یا ہاکاری)، منفوسہ، مخلوط بالہا۔ ان میں سے "ہکار" خالص سنسکرت ہے اور "ہ" کا نام ہے۔ "ہ" اور "ھ" کے تلفظ میں (جب وہ تنہا ہوں) کوئی فرق نہیں ہوتا اس لئے "ہکار" اور "ھکار" برتنے میں یکساں ہیں۔ "ہکاری" گنگا جمنی ہے کہ سنسکرت "ہکار" پر "ی" بڑھا کر وضع کیا گیا ہے اس لئے نامناسب ہے۔ "منفوسہ" عربی نفس (سانس) سے بنایا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ انشا، کرامت حسین، مولانا سلیم اور دوسرے اہل علم ان کو مخلوط بالہا کا نام دیتے ہیں۔ یہ درست ہے لیکن طویل ہے۔

گیا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ آوازیں مفرد نہیں۔ ک ہ، ت ہ اور پ ہ کی ترکیب سے بنی ہیں۔[1] یونانی زبان کی ان آوازوں کو جب اول اول رومیوں نے اپنے یہاں منتقل کیا تو وقفیہ اور "ہ" کو ترکیب دے کر ٹھیک اس طرح لکھا جس طرح اردو میں لکھتے ہیں۔ پرتگالی اور انگریزی میں بھی ان آوازوں کو مرکب حروف سے ہی لکھا جاتا ہے۔

انشاء اللہ خاں انشا زبان کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ انھوں نے دریائے لطافت میں جہاں ان حروف کا ذکر کیا ہے وہاں صاف صاف لکھا ہے کہ "ک ہ" کے میل سے "کھ"، "گ ہ" کے میل سے "گھ" اور د ہ کے میل سے "دھ" وغیرہ آوازیں وجود میں آئیں۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں:-

"نہ اینکہ دو حرف بجائے یک حرف شمار کردہ آید مانند گاف وہائے گھر بمعنی خانہ در ہندی کہ در کتابت سہ حرف است و در تلفظ دو۔"

(دریائے لطافت ص۹)

مطلب یہ ہے کہ ہر چند "گھر" کا تلفظ کرتے وقت زبان سے دو حرف ادا ہوتے ہیں لیکن دراصل اس میں تین حرف ہیں۔ پہلا "گ ہ" سے مرکب اور دو حرفوں کا مجموعہ ہے۔

اس سے دو تین باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ ہندوستان، یونان اور روم کے قدیم اہل علم نے ہائیہ آوازوں کو جدا جدا دو آوازوں کا مجموعہ سمجھ کر انھیں دو حرفوں سے لکھا۔ دوسرے یہ کہ متاخرین اہل علم نے رومی (لاطینی)، پرتگالی، انگریزی، اردو کتابت یا تحریر سے فریب کھا کر انھیں مخلوط بہا وقفیہ (Aspirated stop) نہیں بتایا بلکہ صوتیاتی تجزیہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ آوازیں مفرد نہیں مرکب ہیں۔

ان آوازوں کے مرکب ہونے کی میرے نزدیک سب سے بڑی دلیل ان کا تجزیہ اور تحلیل ہے۔ ملایا کی زبان میں عموماً "بھ" کو "بہ" (ب + ہ) بولتے اور لکھتے ہیں چنانچہ بھاشا (زبان) ان کے یہاں بہاسا اور بھاگیہ (قسمت) "بہاگیا" ہے۔

قدیم ہند آریائی زبان کے بیشتر ہائیوں کا یہ حال ہے کہ اردو میں پہنچ کر وہ تخفیف ہو گئے۔ کہیں ان کی "ہ" چھٹ گئی اور وقفیہ باقی بچ رہا اور کہیں وقفیہ چھٹ کر "ہ" باقی بچی۔ ذیل کے الفاظ ملاحظہ ہوں جن کی "ہ" چھٹ کر وقفیہ بچ رہا ہے:

بھوک (= بھوکھ، س: بھکش)، ہونٹ (= ہونٹھ، س: اوشٹھ)، بھیک (= بھیکھ،

---

[1] ان کی جگہ حسب ذیل شکلوں کو وہ بعد کی پیداوار بتاتے ہیں: θ، ϕ، x

س: بھکشا)، اُن (= انھ)، تم (= تمھ) ذیل کے الفاظ کا وقفیہ تخفیف کی نذر ہوا اور صرف "ہ" باقی بچی:۔

کہنا (س: کتھ)، لہنا (س: لبھ)، سہیلی (س: سکھی)، منہ (س: مکھ)، مینہ (س: میگھ)، گیہوں (س: گودھوم)، رہٹ (س: ارگھٹ)، دہی (س: دُدھ)، سہانا (س: شبھ)، بہن (س: بھگن)۔

ہائیہ آوازیں وقفیہ اور "ہ" کا مجموعہ نہ ہوتیں تو ملائی میں ان کی تحلیل نہ ہو سکتی اور اردو میں جب ان کا ایک جز حذف ہوا تھا دوسرا اس کی قائم مقامی نہ کرتا۔ خود اردو میں بھی قدیم ہائیہ کی تحلیل ہوئی ہے لیکن بہت کم اور ندرت کے ساتھ۔ مثلاً پہل (روئی کا پہل)، سنسکرت پھلکر फलक اس "پھ" نے "پہ" کی شکل اختیار کی۔

ذیل کے الفاظ مخلوط اور محلول دونوں طرح اردو میں مستعمل ہیں:

نہاں (نھاں)، دُلہا (دولھا)، دُلہن (دولھن)، اُدہر (ادھر)، سرہانا (سرھانا)، لہسن (لھسن)، وہاں (وھاں)، یہاں (یھاں)۔ تحلیل کے ساتھ ساتھ اردو میں وقفیہ اور "ہ" کے خلط اور ترکیب کا عمل بھی ہوا ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب "ہ" نے کسی دوسرے حرف سے جگہ بدلی ہو مثلاً:

گھر (س: گرِہم)، پہننا کا متعدی اردو میں پنھانا بھی ہے، یہ سنسکرت "پنہ" (پہننا) سے "ن" اور "ہ" کے خلط کے بعد وجود میں آیا۔

پنھایا سر میں اس کے تاج زر کو
کیا اس کے مرصع تب کمر کو (عشق نامہ نگار ص ۲۲)

"باہر" (سنسکرت دھرہ) دکنی اردو میں عام طور سے "بھار" ہے۔

تیرا جمال انساں کی تعریف تھے ہے بھار آج

(کلیات غواصی ص ۱۲۲)

اس کے برعکس "آبھرن" "ابرہن" ہو گیا ہے۔ ؏

جن کو سنوارا ہے خدا ان ابرہن سوں کیا غرض

(کلیات غواصی ص ۱۲۲)

"پہچان" "معراج العاشقین میں "پچھان" ہوا اور آج اس کا عوامی تلفظ پچھان ہی ہے۔

خصوصیت کے ساتھ اردو کی اس کہاوت میں "جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام"۔

اس مسئلے کا ایک پہلو اور ہے اور وہ یہ کہ اردو کے ہائیوں کو دیکھا جائے کہ وہ کتنی قسم کے ہیں، کہاں سے آئے اور کس طرح بنے؟ ایک بڑی تعداد تر قدیم ہند آریائی ہائیوں کی ہے۔ اردو نے انھیں جوں کا توں رکھا اور ان میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا۔

(۱) کھ = کھ

کھاٹ (کھٹو)، کھجلی (کھرجو)

(۲) گھ = گھ

گھاؤ (گھات)، گھوڑا (گھوٹک)، گھی (گھرت)، گھانس (گھاس)۔

(۳) چھ = چھ

چھاں (چھایا)، چھل (چھل)، چھتری (چھتر)، چھری (چھرکا)، چھدری (چھدرن)۔

(۴) جھ = جھ

جھول (جھولکا)، جھنکار (جھنکار)، جھرنا (جھرا)۔

(۵) ٹھ = ٹھ

ٹھاکر (ٹھکر)، سونٹھ (شنٹھا)۔

(۶) ڈھ = ڈھ

ڈھول (ڈھول)، ڈھال (ڈھال)۔

(۷) تھ = تھ

تھانا (ستھانکم)، تھنکار (تھنکار)

(۸) دھ = دھ

دودھ (دگدھ)، کندھا (سکندھ)، دھن (دھن)، دھنک (دھنک)۔

(۹) پھ = پھ

پھل (پھل)، پھن (پھنکڑ)، پھین، پھین۔

(۱۰) بھ = بھ

بھائی (بھراتر)، بھلا (بھدر)، گابھن (گربھن)، بھانڈا (بھانڈ)۔

کچھ اردو میں ہند آریائی آوازوں میں تصرف کے بعد وضع ہوئے۔ ذیل میں ان کا مع ان

آوازوں کے جن سے یہ وضع ہوئے اختصار کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے

(۱) کھ = "کش" یا "شک"

ایکھ (اکش)، آنکھ (اکش)، مکھی (مکشکا)، گوکھ (گکش)، سوکھا (شُشک)۔

(۲) چھ = "تس" یا "شچ"

مچھلی (مسیہ لی)، بچھڑا (وتسک)، بچھو (ورشچک)، پیچھے (پشچا)

(۳) "ٹھ" = شٹ

اٹھ (آشٹ)، میٹھا (مرشٹم)، کاٹھ (کاشٹ)، بیٹھ (اپ وشٹ)

(۴) تھ = ست

ہاتھ (ہست)، ہاتھی (ہست)، تھن (ستن)، پوتھی (پستکا)، پتھر (پرستر)۔

(۵) "پھ" = شپ

بھاپھ۔ بھاپ (واشپ)۔

(۶) "تھ" = سن

تھان (تسان)، کنھیا (کرشن)۔

(۷) جھ = دھی[1]

بوجھ (بدھی)، بانجھ (بندھیا)، سانجھ (سندھیا)

یہ تمام ہائیہ مخلوط حروف کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ قاعدے کے مطابق انھیں مخلوط ہونا چاہیے۔ ان کے وضع کا طریقہ بھی یہی بتاتا ہے کہ یہ مخلوط ہیں۔ جن حروف سے یہ بنے ان کا ایک جزء صفیریہ (س یا ش) تھا۔ اردو کے عام مزاج کے مطابق صفیریہ "ہ" سے بدلا اور وقفیہ میں جو پہلے سے "س" یا "ش" کے ساتھ مخلوط تھا گھل مل گیا۔

صوتیات کے اعتبار سے ہائیہ ہر چند ایک نئی آواز ہے جو غیر ہائیہ وقفیہ سے الگ اور اس سے مختلف ہے۔ یہ وقفیہ + ہ ہے لیکن وقفیہ سے الگ اس کا کوئی مخرج نہیں۔ ک، گ کا جو مخرج ہے وہی کھ، گھ کا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ک، گ وغیرہ کے تلفظ میں سانس رک جاتا ہے کھ، گھ میں سانس جاری رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ فرق طرزِ ادا کا ہے۔

---

[1] دھی سے جھ اس طرح بنا کہ "ی" نے "ج" کی شکل اختیار کی اور "دھ" نے "ہ" کی۔ پھر ج۔ "ہ" کی ترکیب سے "جھ" وجود میں آیا۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کہتے ہیں کہ ہائیہ اور غیر ہائیہ وقفیوں میں باہمی فرق کو میں بھی مانتا ہوں لیکن یہ بنیادی فرق نہیں کیفیت یا طرزِ تلفظ کا ہے۔ ہائیہ کو ادا کرنے میں سینے کے فضلات سے سانس کا جھونکا نکلتا محسوس ہوتا ہے۔ صوتی اعتبار سے ہائیہ " وقفیہ + ہ " سے الگ اور عملاً اس سے مختلف آواز نہیں۔

یہ درست ہے کہ ہائیہ آوازوں میں وقفیہ کے ساتھ "ہ" شیر و شکر ہو گئی ہے کہ پوری آواز ایک ہی کوشش اور ایک ہی جھٹکے میں ادا ہوتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ ہائیہ آوازیں مفرد یا بسیط ہیں۔ "ہ" کے شیر و شکر ہونے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ ہم ان آوازوں کو مخلوط اور بمنزلہ مفرد قرار دے سکتے ہیں۔ قدیم و جدید ہائیوں میں فرق کرنا بھی درست نہیں۔ "ہ" کے شیر و شکر ہونے میں دونوں قسم کے ہائیے شریک ہیں۔ جس طرح ک، ہ کے خلط و میل سے "کھ" وجود میں آیا اسی طرح ل ہ" کے ملاپ سے "لھ" اور "ن ہ" کے ملاپ سے "نھ" کا جنم ہوا۔ کھ گھ وغیرہ آوازیں اگر ایک کوشش اور ایک جھٹکے میں ادا ہوتی ہیں تو لھ، مھ، نھ وغیرہ کے ادا کرنے کے لئے بھی صرف ایک کوشش یا ایک جھٹکا درکار ہے۔ طرزِ ادا، تلفظ اور سماعی اثر کے لحاظ سے قدیم اور جدید ہائیوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ہائیہ آوازوں کی تاریخ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دس ہائیے قدیم ہیں جو قدیم ہند یورپی میں بھی تھے لیکن یورپی زبانوں کا رجحان یہ رہا ہے کہ ہائیہ کم کر کے ان کی جگہ نئے صفیریے (Spirants) وضع کئے جائیں۔ اگرچہ قدیم ہند یورپی میں "ہ" کا وجود نہ تھا لیکن ہائیہ تقریباً سب تھے۔ اوستائی نے ان میں سے ذیل کے پانچ ہائیوں کو برقرار رکھا، باقی چھانٹ دیے۔

کھ، گھ، تھ، دھ، پھ۔

ان سے بہ ترتیب ذیل کے سفیریے وجود میں آئے۔

خ، غ، ث، ذ، ف۔

یونانی میں صرف کھ، تھ، پھ تین ہائیے تھے جنھوں نے بعد میں خ، ث، ف (x ϕ θ) کی شکل اختیار کی۔

جدید ہند آریائی زبانوں میں سے اردو پوری طرح قدیم ہند آریائی زبان کی نمائندہ ہے۔ ایک طرف اس نے قدیم ہائیوں کو جوں کا توں برقرار رکھا دوسری طرف جدید ہائیے وضع کر لئے۔ قدیم

ہائیوں میں سے دس اس نے قدیم ہند آریائی سے لیے۔ ان کا ذکر سطور بالا میں کر چکا ہوں اور ان کی مثالیں بھی لکھ چکا ہوں۔

یہ ہائیے اردو کے صوتی نظام میں کچھ اس طرح رچ بچ گئے ہیں کہ کلمے کے ابتدا، درمیان اور آخر میں ہر جگہ ملتے ہیں۔

ہائیہ	ابتدا میں	وسط میں	آخر میں
۱۔ کھ	کھال	پرکھا	آنکھ
۲۔ گھ	گھول	بگھار	باگھ
۳۔ چھ	چھال	مچھلی	مونچھ
۴۔ جھ	جھول	منجھلا	سانجھ
۵۔ ٹھ	ٹھٹھول	گٹھیلا	لٹھ
۶۔ ڈھ	ڈھول	منڈھا	مڈھ
۷۔ تھ	تھوڑا	ماتھا	نتھ
۸۔ دھ	دھواں	گدھا	دودھ
۹۔ پھ	پھول	پھپھل	(بھاپھ) "پھ" نے بعد میں "پ" کی شکل اختیار کی۔
۱۰۔ بھ	بھاؤ	سنبھل	جیبھ

جدید ہائیوں کا حال ذیل کی جدول سے ظاہر ہوگا۔

ہائیہ	ابتدا میں	درمیان میں	آخر میں
۱۔ رھ	رھڑی (رھڑی)	ارھر، سرھانا	
۲۔ ڑھ		داڑھی	بڑھ
۳۔ لھ	لھوڑا، لھسن	ملھار	+
۴۔ مھ	مھارا (دیہات)	کمھار	تمھ (تم)
۵۔ نھ	نھان	ننھا	انھ (ان)
۶۔ وھ	وھاں	+	+ "واں" اس کی تخفیف ہے۔
۷۔ یھ	یھاں	×	× "یاں" اس کی تخفیف ہے۔

کلمے کے ابتدا میں ہائیوں کا استعمال نسبتاً زیادہ دیکھا گیا ہے اور ان میں کسی قسم کا تصرف

نہیں ہوا۔ شروع کلمے سے "ہ" کی تخفیف میری نظر سے نہیں گذری۔ درمیان اور آخر سے البتہ دکنی اردو میں ہائیے حذف ہوئے ہیں۔ درمیان سے کم اور آخر سے زیادہ جیسے: چڑنا (چڑھنا)، باندنا (باندھنا)، نبانا (نباھنا)، انوں (انھوں)، جنوں (جنھوں)، تمارا (تمھارا)، راک (راکھ)، ابی (ابھی)، سات (ساتھ)، دود (دودھ)، مج (مجھ)، تج (تجھ)، کچ (کچھ)، پنانا (پنھانا)، جیب (جیبھ)، ہات (ہاتھ)، یہ دکنی کا عام رجحان نہیں۔ دکنی میں ہائیے بھی ہیں۔ چند مثالیں معراج العاشقین سے لے کر درج کی جارہی ہیں:۔

پچھاننا (پہچاننا)، سنبھالنا، دکھلانا، دودھ، تھیں، کوچھ (کچھ)، آنکھ (آنچ)، پانچھ (پانچ) ان میں سے آخر کے دو لفظوں میں ہائیہ دکنیوں نے اضافہ کیا۔

اگر یہ دکنی اردو کا عام رجحان ہے تو اردو کی سرشت اور اس کی فطرت کے خلاف ہونے کی وجہ سے اسے دکنی کی پاس پڑوس کی غیر آریائی (دراوڑ) اور آریائی زبانوں میں سے گجراتی اور مراٹھی کا خارجی اثر یعنی پرچھاواں کہنا چاہئے۔ دراوڑ زبانوں میں تو سرے سے ہائیہ کا وجود ہی نہیں، رہی گجراتی اور مراٹھی سو وہ بیرونی زبانیں ہیں اور بیرونی زبانوں نے جیساکہ چٹرجی نے لکھا ہے، مجہورہ (اور کہیں کہیں مہموسہ) ہائیوں نیز "ہ" کے ساتھ ایک نیا اور مختلف قسم کا سلوک روا رکھا اور گجراتی کی طرح "ہ" اور ہائیہ کو ہمزہ سے ملتے جلتے حلقی آواز سے بدل دیا۔ دن دھاڑے دالے "دھاڑے" کو گجراتی ڈوآڑو بولتے ہیں۔

ذیل کے امور خاص طور سے اس سلسلے میں توجہ کے قابل ہیں:

۱۔ دکنی نے عموماً کلمے کے آخری ہائیہ کی تخفیف کی ہے جیسے: سات (ساتھ)، ہات (ہاتھ)، مج (مجھ)، تج (تجھ)، کچ (کچھ)۔

۲۔ زیادہ تر اردو کے جدید وضعی ہائیہ حذف کئے گئے ہیں۔ جیسے: پنانا (پنھانا)، چولا (چولھا)، چڑنا (چڑھنا)، انوں (انھوں)، جنوں (جنھوں)، تمارا (تمھارا)۔

غنہ آوازیں

غنہ کے معنی ہیں گنگناہٹ۔ ناک کے بانسے میں پیدا ہونے یا ناک سے گذرنے کی وجہ سے کچھ آوازیں غنہ (Nasal) کہلاتی ہیں۔ ان کو ادا کرتے وقت ہوا منھ کی جگہ ناک سے نکلتی ہے۔ ناک بند کرنے کے بعد غنہ آواز ادا نہیں کی جاسکتی۔

اردو میں "م" "ن" دو غنہ آوازیں ہیں۔ "م" شفوی یعنی ہونٹ والی آواز ہے۔ اسے ادا کرتے وقت اوپر نیچے کے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے ہیں۔ "ن" لثوی ہے۔ اسے زبان کی نوک اور سخت تالو سے ادا کیا جاتا ہے۔ یہ آوازیں متحرک بھی ہوتی ہیں اور ساکن بھی۔ کلمے کے شروع میں بھی آتی ہیں اور درمیان یا آخر میں بھی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

مستان	سموسہ	نام
مہرہ	سلامت	امام
نیام	نشا	آن
ناخون	اگنا	بن

"ن" ساکن کی اظہار و اخفا دو صورتیں ہیں جن کا ذکر متقدمین نے کیا ہے۔ اظہار کی دو قسمیں ہیں۔ اظہار تمام جب "ن" کی آواز کسی دوسری مصمت صحیح آواز کے ساتھ خلط ملط نہ ہو اور وضاحت کے ساتھ اپنے مخرج سے ادا کی جائے۔ جیسے :

آن ۔ بَن ۔ بَن باسی ۔ بِن بیاہا ۔ بندر ۔ بنگی ۔ سندور ۔ بھنگا۔

دوسرے اظہار ناقص۔ اس صورت میں "ن" کسی دوسری آواز سے مل کر اور اپنے مخرج سے ہٹ کر ادا ہوگا۔

۱- غشائی یا حلقی آوازوں (ک، گ) کے ساتھ زبان کی جڑ سے۔ جیسے:
انگارہ، انگلی، رنگین، ڈنگا، ڈنکا، پھنکی۔

۲- جن کی آوازوں (ج، چ) کے ساتھ تالو سے۔ جیسے:
رنجیدہ، گنجا، جھنجلا، انجار، کنچا۔

۳- ملفوظی (ٹ، ڑ) کے ساتھ تالو کے پچھلے حصے سے۔ جیسے:
منڈپ۔ منڈوا۔ انٹا۔ ٹنٹا۔

۴- شفوی (ب، پ) کے ساتھ ہونٹ سے ("م" کے مشابہ) جیسے:
انبار۔ انبہ۔ رنبھا۔ چنپا۔

۵- اسنانی (ت، د) کے ساتھ دانت سے۔ جیسے:
گنتی۔ گندا۔ بندھن۔ بندا۔

یہ "ن" حرف صحیح مصمت (Consonant) ہے کہ ایک نقطے سے (زبان کے سہارے) ادا ہوتا ہے۔

اخفا کی صورت میں "ن" کا مخرج (Place of Articulation) نہیں ہوتا نہ کوئی آلہ صوت (Articulation) ہوتا ہے۔ ناک میں گونج سی پیدا ہوتی ہے اور بس۔ مثلاً:
ہنس (ہنسنا سے امر)، رنگا (رنگا ہوا)، اندھیرا وغیرہ۔

ان الفاظ کا ہنس (جانور) رنگا (رنگا رنگ میں) اور اندھیر (زیادتی) جیسے الفاظ سے مقابلہ کرنے پر اخفا اور اظہار ناقص کا فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پہلی مثالوں میں اخفا ہے دوسری مثالوں میں اظہار ناقص۔

متقدمین علما اظہار ناقص اور اخفا میں فرق نہیں کرتے۔ دونوں کو اخفا کہتے ہیں۔ میری رائے میں اظہار ناقص کو غنہ کہنا چاہئے اور اخفا کو مغنونہ (Nasalised) جس کے معنی ہیں غنہ کیا گیا۔ اخفا کی صورت میں حرکت یا علت میں غنگی (گنگناہٹ) پائی جاتی ہے اس لئے اسے مغنونہ کہنا مناسب ہوگا۔ مغنونہ حرکت ہوگی یا علت اس حرکت یا علت کو مغنونہ کہیں گے جس میں "ن" کی صفت یعنی غنگی پائی جائے۔ غنہ اور مغنونہ میں حد فاصل دو باتیں ہیں:

۱- مغنونہ مصوتہ (Vowel) ہے اور غنہ مصمت (Consonant)

۲- مغنونہ بعد کے حرف سے مل کر رکن بنتا ہے۔ غنہ میں دو رکن ہوتے ہیں مثلاً ہنسا (ہنس)

میں دو رکن ہیں۔ وہ فعلن کے وزن پر ہے۔ اور ہنسا (ہنسنا کی ماضی) میں ایک اس کا وزن فعل ہے۔
ہر حرکت و علت کو غنایا جا سکتا ہے۔ اردو میں جتنی حرکات و علل ہیں اتنے ہی مغنونہ بھی ہوں گے۔ مثلاً:

۱۔ ـَـں — رنگا، جنور، گنوار
۲۔ ـَـاں — جانگھ، سانوریا
۳۔ ـِـں — سِنکنا
۴۔ ـِـیں — جھینکنا، سینچنا
۵۔ ـُـں — گنجلک، ٹھنکنا، کنوآں
۶۔ ـُـوں — گونج، اونچ
۷۔ ـِـیں — بینچ، کھینچ
۸۔ ـَـیں — ہیں، بھینس
۹۔ ـُـوں — گھونگا، ٹھونگنا
۱۰۔ ـَـوں — دھونکنی، اوندھا

ان کے علاوہ چار خفیف حرکات (یا علل) ہیں جن کے لئے اردو میں کوئی خاص علامت نہیں۔ ان کی بھی مغنونہ شکلیں ہوں گی۔

۱۔ منھ، مہندی — (کسرہ خفیفہ)
۲۔ مہنگا — (فتحہ خفیفہ)
۳۔ مہنال، دھنگار — (ضمہ خفیفہ)
۴۔ پہنچا، پہنچی — (لین خفیف)

نصف علل (و، ی) کو بھی غنایا گیا ہے۔ جیسے:

گانوں، چھانوں، دایں، بھایں۔

اس حساب سے اردو میں غنہ آوازوں کی حسب ذیل تین قسمیں ہیں:

۱۔ م، ن (متحرک و ساکن)۔ یہ خالص انفی (ناک کی) (Nasal) آوازیں ہیں۔
۲۔ غنہ (ن وصلی یا مخلوط) جسے انگریزی میں (Homorganic nasal) کہتے ہیں۔
۳۔ مغنونہ (غنائی ہوئی حرکات و علل) یعنی (Coloured Vowel)۔

عام طور سے پہلی اور دوسری قسموں میں فرق نہیں کیا جاتا۔ دونوں کو انوناسک کہا جاتا ہے۔ لیکن قدیم ہندوستان میں ان میں فرق کیا جاتا تھا۔ پہلی قسم کی آوازوں کو ناسکی (= ناک والی) کہا جاتا تھا اور دوسری قسم کی آوازوں کو انوناسک (= ناک والی آوازوں سے متعلق) مشہور قواعد نویس پانینی اور دوسرے نحوی صفیریہ (س، ش) اور نصف علت (ر، ل، و، ی) کے ساتھ مخلوط ہونے والے "ن" کو انسوار (انو + سور) کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کے معنی ہیں سور یعنی حرکت کا تابع۔ اس "ن" کو ادا کرتے وقت ناک اور منھ دونوں کھلے رہتے ہیں اور دونوں سے بیک وقت ہوا نکلتی ہے شاید اس لئے ان علما نے اسے انسوار کہا اور اس کے لئے ایک نئی علامت بندی یا چندر بندو (ہلالی قوس) وضع کی۔ تیسری قسم کی اردو غنہ آوازوں میں صاف طور سے یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ یعنی ادا کرتے وقت منھ اور ناک دونوں سے ہوا نکلتی ہے اس لئے انھیں انسوار کہنا زیادہ صحیح اور قرین قیاس ہوگا۔

بہر حال یہ تین طرح کی آوازیں ہیں۔ ان میں امتیاز کرنا اور الگ الگ ناموں سے انھیں یاد کرنا مناسب ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کی آوازیں واضح اور ٹھوس ہیں۔ اردو تحریر میں انھیں مخصوص علامات (م، ن) سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کی آوازیں "ن" کی ضمنی شکلیں ہونے کے باعث "ن" سے مختلف نہیں کہ انھیں بہر حال مخصوص علامات سے ظاہر کیا جائے اور ان کے لئے ان کی ہم صحبت آوازوں کے تعلق سے خاص خاص علامتیں رکھی جائیں جیسا کہ دیوناگری میں ہے۔ اس مخلوط یا وصلی "ن" کو بآسانی صوتی اصول کے پیش نظر کسی ایک علامت سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ خود پانینی کے نزدیک وصلی "ن" کے لئے حرف کے اوپر "ن" کی شکل کی چھوٹی سی بندی استعمال کی جا سکتی تھی اور کاتب کو اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق تنہا بندی استعمال کرے۔ ڈاکٹر ایلن کہتے ہیں۔ وصلی "ن" کی جگہ بندی کے استعمال کا جواز اہل علم کے نزدیک تحریری (Graphic) ہے۔ اس کی بنا سہولت پر ہے کہ غنائیت (Nasality) کو الگ الگ حروف و علامات لکھنے کے مقابلے میں تنہا ایک نقطہ یا بندی یعنی نصف "ن" سے ظاہر کرنا آسان ہے۔ لیکن پانینی کا علم و فضل اس کا متقاضی ہے کہ اس جواز کی کوئی صوتی وجہ تلاش کی جائے۔ ⁽¹⁾

آئیے ہم اس کی صوتی وجہ تلاش کریں۔ لیکن اس سے پہلے صوتی (Phonological) اور صوتیاتی (Phonetic) کا فرق واضح ہو جانا چاہئے۔ علم صوت کا تعلق آواز کے ادا اور اس کی سماعت سے ہے اور صوتیات کا آواز کی ماہیت اور اس کی ساخت سے۔ صوتی لحاظ سے یہ دیکھنا

جاتا ہے کہ بولنے والے نے آواز کو کس طرح ادا کیا۔ اور یہ فیصلہ ایک عام سامع کے احساس و شعور کے مطابق کیا جاتا ہے۔ صوتیات میں متکلم کے وجدان اور خارجی آلات کی مدد سے آواز کے مخرج، آلۂ صوت، یا نقطۂ ادا کی ٹھیک ٹھیک تعین کی جاتی ہے۔ "ن" وصلی پر صوتیات کی رو سے بحث کر کے میں بتا چکا ہوں کہ اس کی آواز بعد میں آنے والی آواز کے ساتھ خلط ہو کر اس مقام سے ادا ہوتی ہے جہاں سے بعد میں آنے والی آواز ادا ہوئی تھی۔ صوتی صورت یہ وہ واحد آواز ہے۔ سننے والا ناک میں گونجنے والی آواز سنتا ہے اور بولنے والا صرف یہی ایک آواز محسوس کرتا ہے۔ خواہ یہ غشائی یا حلقی آواز کے ساتھ گڈمڈ ہو یا لطوفی، لسانی، سفیری اور نصف علت کے ساتھ۔ ان کے مخارج مختلف ہو سکتے ہیں۔ آوازیں سب یکساں اور متجانس یعنی ہم جنس ہیں۔ ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ البتہ شفوی آوازوں کے ساتھ مخلوط ہونے والے "ن" کی آواز لسانی اسنانی آوازوں کے ساتھ مخلوط ہونے والے "ن" کی آواز سے مختلف ہے۔ ان میں تحریری طور پر فرق کیا جا سکتا ہے۔ بقیہ آوازوں میں فرق کرنے کی بظاہر کوئی صوتی وجہ نہیں۔ ڈاکٹر ایلن لکھتے ہیں:-

"The Homorganic nasal form a single phonological unit, and a phonological transcription will recognise this fact.',

اردو کی طرح اوستائی نے بھی وصلی "ن" کو ایک صوتی اکائی مانتے ہوئے اس کے لئے صرف ایک علامت (ﮯ) رکھی ہے۔

اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شفوی حروف سے پہلے غنہ کو "م" سے لکھنا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو الفاظ اصلاً "م" سے ہیں یعنی ان کے مادے میں "م" ہے انھیں "م" سے لکھا جائے اور جن کی اصل میں "ن" ہے انھیں "ن" سے۔ اس قاعدے کے مطابق "انبیا" کو جو نبی کی جمع ہے "م" سے لکھنا درست نہ ہوگا۔ البتہ "انبہ" کو "م" سے لکھا جا سکتا ہے کہ وہ سنسکرت "آمر" سے وضع ہوا ہے۔ "مغنونہ" کو بہر حال "ں" سے لکھا جائے کہ وہ خالص غنہ آواز ہے۔ شفوی حروف کی صحبت میں بھی اس کی یہ کیفیت برقرار رہتی ہے اور کسی طرح بھی "م" کی آواز سننے میں نہیں آتی۔ جیسے: تنبولی، چنبیلی وغیرہ۔

اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ (ن گ) اردو کی مستقل غنہ آواز نہیں۔ غشائی "گ" کے ساتھ وصل ہونے والا "ن" ہے۔ اگر یہ اردو کا مستقل غنہ ہوتا ہے تو "م"، "ن" کی طرح

متحرک ہوتا اور کلمے کے شروع میں جگہ پاتا۔ جو لوگ اسے مستقل غنہ بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ سنگین رنگین وغیرہ کلمات میں انگریزی (Singer) کی طرح "گ" سے پہلے "ن گ" کی آواز سننے میں آتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ آواز سنگ رنگ میں بھی ہے۔ اگر سنگین، رنگین وغیرہ کلمات میں "ن" کی آواز "ن گ" کے مساوی ہے تو "سنگ، رنگ" کے "ن" کی آواز "ن گ" کے مساوی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ اردو "پھنکی" میں "ک" سے پہلے "ن ک" کی آواز سنی جاتی ہے۔ "ن گ" کی طرح "ن ک" بھی اردو کا مستقل غنہ ہونا چاہیے۔ پھر غشائی کی کیا خصوصیت ہے۔ سنسکرت کی طرح ہر وقفیہ (Stop) کے مقابلے میں ایک جداگانہ غنہ آواز مانی جائے اس لیے کہ "رنجیدہ" میں مثلاً "ج" سے پہلے "ن ج" کی آواز محسوس ہوتی ہے اور "انڈا" میں "ڈ" سے پہلے "ن ڈ" کی۔

یہ سب کچھ عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ غنہ آوازیں "ن" کی مختلف شکلیں ہیں۔ انھیں "ن" کے ضمنی یا ذیلی روپ قرار دیا جائے گا۔

کچھ لوگ جنھیں صوتیات کا تازہ تازہ شوق ہوا ہے یہ دیکھ کر کہ انگریزی میں /ن گ/ مستقل غنہ آواز اور "ن" سے الگ ایک صوتیہ ہے یہ سمجھے کہ اردو میں بھی یہ صوتیہ ہوگا۔ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ کسی زبان کا مستقل صوتیہ، ہو سکتا ہے کہ دوسری زبان کا صوتیہ نہ ہو۔ ڈاکٹر جونز نے اپنی کتاب کے آٹھویں باب میں تفصیل سے بحث کر کے اور بہت سی مثالیں دے کر لکھا ہے۔ ایک زبان کی جو آوازیں مختلف صوتیوں سے تعلق رکھتی ہیں وہی آوازیں کسی دوسری زبان میں ایک صوتیہ کی ضمنی ذیلی شکلیں ہوتی ہیں۔ "ن" اور /ن گ/ کو پیش کر کے ڈاکٹر جونز فرماتے ہیں (ص ۳۲) انگریزی، جرمن، چینی، سواحلی وغیرہ زبانوں میں یہ دو مستقل صوتیے ہیں۔ لیکن اطالوی، ہسپانوی اور ہندوستانی (اردو ہندی) میں /ن گ/ "ن" کی ضمنی شکل ہے۔ ڈاکٹر جونز کی اس تصریح کے بعد اردو میں /ن گ/ کی ضمنی حیثیت کے بارے میں ذہن کے کسی گوشہ میں شبہ باقی رہنے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آتا۔

مغنونہ البتہ غنہ اور "ن" سے الگ ایک صوتیہ ہے۔ ذیل کے لفظی جوڑے مغنونہ اور غنہ کا فرق واضح کر کے انھیں مستقل حیثیت دیتے ہیں:-

ہنس (ایک جانور)	ہنس (ہنسنا سے امر)
رنگا (رنگا رنگ)	رنگا (رنگا ہوا)

ذیل کے لفظی جوڑوں سے مغنونہ اور "ن" (ساکن) کا استعمال ثابت ہوتا ہے۔

سنکی	سنکی (سنکی ہوئی)

منڈی (ایک بوٹی)　　　　منڈی (منڈی ہوئی)

"ن" ساکن (وسط میں ہو یا آخر میں) کے لئے اردو میں قدیم سے جزم (د) استعمال ہو رہا ہے یغنونہ آخر کلمے میں ہو تو "ن" کے پیٹ میں نقطہ نہیں دیتے۔ ان علامات کو برقرار رکھا جائے۔ درمیانِ کے کلمے میں آنے والے مغنونہ کے لئے بابائے اردو نے ہلالی شکل (چندر بندو) تجویز کی تھی۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ اب صرف غنہ باقی بچتا ہے۔ اس کے بارے میں میری رائے ہے کہ اسے ایک دائرے سے ظاہر کیا جائے۔ ان علامات و اشکال کا استعمال اردو کی تین قسم کی غنہ آوازوں میں فرق و امتیاز قائم رکھنے کے لئے کافی ہوگا۔

روزمرہ اور محاورہ

غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

"لغت محاورے اور اصطلاح میں قیاس پیش نہیں جاتا۔"[1]

زبان کے سرمایہ الفاظ و مرکبات کے دو حصے ہیں۔ اول قیاسی دوم سماعی۔ زبان کا قیاسی حصہ اصول و قواعد کے مطابق ہوتا ہے اور اس میں یکسانی پائی جاتی ہے۔ زبان کا سماعی حصہ کسی اصول کا پابند نہیں ہوتا اور زبان کے لگے بندھے قاعدوں کی حدود و قیود سے خارج ہونے کے باعث اس میں ایک طرح کی ناہمواری دیکھی جاتی ہے۔ سماعی حصے کو لغت اور قیاسی کو صرف و نحو یعنی گرامر کہتے ہیں۔ مشہور ماہر لسانیات ہنری سویٹ کہتا ہے: "جب تک زبان کی بقا اور نشو و نما یا ارتقا کا تعلق روایت سے ہے اس میں روایتی یا سماعی عنصر کا ہونا ضروری ہے۔"[2]

قیاسی منطقی یا عقلی کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ چیز جو عقل و منطق کے مطابق ہو اور جس کے بارے میں قیاس سے کام لے کر فیصلہ کیا جا سکے۔ یہاں قیاسی کے یہ معنیٰ مراد نہیں۔ زبان کا کوئی حصہ ایسا نہیں جسے منطقی کہا جا سکے اور اس کی عقلی توجیہ ممکن ہو۔ ہر چند صرفی نحوی عناصر کو ہم قیاسی کہتے ہیں لیکن عقل و قیاس سے کام لے کر ہم ان کی عقلی توجیہ نہیں کر سکتے۔ مثلاً کوشش کے باوجود ہم نہیں بتا سکتے کہ کھانا میں "نا" مصدر کی علامت کیوں ہے؟ اور اسے مصدر سے کیا خصوصیت ہے؟ "جانا" اور اس کے مشتقات کی مدد سے فعل مجہول بنانے کی وجہ کیا ہے؟ یا مادے کے آخر میں "تا تھا" بڑھانے سے ماضی استمراری کیسے بنی؟ زبان قطعی غیر منطقی مظہر ہے۔ منطق کا تعلق معقولات سے ہے اور زبان کا الفاظ سے۔ الفاظ منطقی تجزیے کی حدود سے باہر اور اس کے

---

[1] اردوئے معلیٰ ص ۳۳۔ [2] تاریخ زبان ص ۶۔

اثرات سے دور رہتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ لسانیات کی مدد سے الفاظ و مشتقات کی توجیہ ممکن ہے۔ میکس مولر نے گرامر اور لسانیات کا فرق بتاتے ہوئے لکھا تھا "گرامر 'کیا' ہے اور لسانیات، 'کیوں'۔" گرامر الفاظ و کلمات کا محض تعارف کراتی ہے، لسانیات ان کی تعریف کرتی ہے۔ گرامر بتاتی ہے کہ "کھانا" مادہ "کھا" اور علامت مصدر "نا" سے ترکیب پا کر بنا ہے۔ لسانیات اس لفظ کی حقیقت بے نقاب کر کے اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ 'نا' مصدر کی علامت کیوں ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ لسانیات کا 'کیوں'، منطق کے 'کیوں' سے مختلف ہے۔ لسانیات کا 'کیوں'، تاریخی ہے اور منطق کا 'کیوں' ذہنی اور عقلی۔ لسانیات کی توجیہ تاریخی ہوتی ہے۔ وہ لفظ کی تاریخ اور اس کے ارتقائی دوروں کی نشان دہی کرتی ہے۔ مثلاً اوپر کی مثال میں لسانیات صرف یہ بتائے گی کہ 'نا'، علامت مصدر سنسکرت یا قدیم پراکرت علامت اسم سے ماخوذ ہے۔ موجودہ شکل اختیار کرنے سے پہلے اس میں فلاں فلاں تغیرات ہوئے۔ وہ یہ نہیں بتائے گی کہ سنسکرت علامت اسم کی حقیقت کیا ہے اور کس لئے قدیم زمانے میں علامت اسم کے سوا اس سے کسی اور علامت کا کام نہیں لیا گیا۔

بہر حال یہ طے ہے کہ زبان کا تعلق منطق سے نہیں نطق سے ہے اس لئے اس میں منطقی قاعدے جاری نہیں ہوتے۔ زبان کے صرفی نحوی عناصر کو قیاسی اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ ایک قاعدے کے تحت آتے ہیں اور ان میں ہمواری یا یکسانی پائی جاتی ہے جو عام طور سے باقاعدہ مظاہر و مناظر یا اشیاء میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسے ایک مثال سے واضح کرتا چلوں۔ اردو کا قاعدہ ہے کہ جو مادے حرف صحیح پر ختم ہوئے ہیں ان کے آخر میں الف بڑھانے سے ماضی مطلق کا صیغہ واحد غائب بن جاتا ہے جیسے پڑھ سے پڑھا، دیکھ سے دیکھا، چل سے چلا، اٹھ سے اٹھا، ہنس سے ہنسا۔ یہ قاعدہ جان لینے کے بعد ہر مادے سے ماضی مطلق کا صیغہ واحد غائب ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ تمام مادوں کے ڈھلے ڈھلائے ماضی کے صیغے لغت کی طرح کسی فرہنگ میں یکجا کئے جائیں۔ اسی طرح اگر ہم یہ جانتے ہوں کہ مادے پر "تا ہے" اضافہ کرنے سے فعل حال بنے گا اور "تا تھا" بڑھانے سے ماضی استمراری تو ہم قیاس لغوی سے کام لے کر ہر مادے سے فعل حال اور ماضی استمراری کے صیغے وضع کر سکتے ہیں۔ زبان کے تمام صرفی نحوی عناصر کی یہی کیفیت ہے۔ ان کے مقررہ قاعدے اور معینہ ضابطے میں جن کا

جاننا اور سمجھ کر ازبر کر لینا اس امر کے لئے کافی ہے کہ ہم حسب ضرورت الفاظ وضع کریں۔ وضع کردہ الفاظ کا مجموعہ بنانا اور لغت کی طرح اپنے پاس محفوظ کرنا یکسر غیر ضروری ہے۔

سماعی، قیاسی کے مقابلے میں ہے۔ قیاسی کے معنی تھے جس میں قاعدے کو دخل ہو یا جو کسی قاعدے کے تحت اور اس کے مطابق بنا ہو۔ سماعی کے معنیٰ ہوں گے جس میں قاعدے کا عمل دخل نہ ہو یا جہاں قاعدوں کا سا انضباط نہ پایا جائے۔ اس اعتبار سے زبان کے سماعی عنصر کی دو قسمیں ہوں گی۔ پہلی قسم ان الفاظ و کلمات کی ہے جن کا سرے سے کوئی قاعدہ نہیں اسے لغت کہتے ہیں۔ زبان کے جملہ غیر مرکب (جامد) الفاظ و کلمات اور مادے اس قسم میں شامل ہیں۔ گھوڑا، بچہ، بھوک، پیاس کھانسی، بجلی، ہاتھ، پانو، منھ، ناک وغیرہ مفردات اور کھا، پی، چل، اٹھ، بیٹھ، آ، جا، کر، دیکھ، لا، بچھا، چمک، وغیرہ مادے اردو زبان کا ایک اہم حصہ ہیں اور زبان کے لئے ان کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ یہ سب سماعی ہیں جنھیں بزرگوں اور دوستوں سے سن کر ہم نے ذہنوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ ان کا کوئی قاعدہ نہیں جس طرح مادوں سے ماضی کے صیغے قاعدے کے مطابق وضع ہوئے تھے اور ہر مادے سے وضع کئے جا سکتے تھے۔ اسی طرح حروف یعنی بسیط آوازوں سے یہ مادے وضع نہیں ہوئے اور نہ کسی فارمولے کے مطابق وضع کئے جا سکتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ تمام الفاظ، کلمے اور مادے جو روایت سے زندہ ہیں اور نسلاً بعد نسل زمانۂ قدیم سے زبانوں پر نقل ہوتے چلے آئے ہیں یکجا کر کے ضبط کر لئے جائیں۔

غیر مرکب لفظ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا جز یا کوئی حصہ معنیٰ کے جز یا حصے پر دلالت نہیں کرتا۔ گھوڑا، اکا، بیس، تیس، اکتیس، یہ تمام الفاظ غیر مرکب یعنی مفرد ہیں اور مجموعی طور سے ایک ذات با معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ گھوڑا ہنہنانے والا چوپایہ ہے اور اکا ایک گھوڑے کی گاڑی۔ یہی حال بیس اور اکتیس کا ہے۔ ان میں کا ہر لفظ ایک معنیٰ ادا کرتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ بیس جو دو (= دو) اور ونشت (= دس) سے مرکب ہے اردو میں مرکب نہیں سمجھا جاتا۔ ب۔ ی۔ س (= بیس) تینوں حرف مل کر ۲۰ کا مفہوم ادا کرتے ہیں، لیکن اکتیس اردو میں مرکب ہے۔ (اک + تیس) استعمال میں دونوں برابر ہیں۔ جس طرح بیس مجموعی طور سے ۲۰ ہے (نہ کہ ۱۰+۱۰) اسی طرح اکتیس ۳۱ ہے نہ کہ (۱+۳۰) اول مفرد ہے دوم بمنزلہ مفرد۔ دونوں کو لغت کہتے ہیں اور غالب کی مذکورہ بالا عبارت میں لغت کے دونوں قسم کے مفرد الفاظ مراد ہیں۔

سماعی عنصر کی دوسری قسم میں وہ الفاظ شامل ہیں جن کا کوئی لگا بندھا قاعدہ نہیں یا جو کسی ایک قاعدے کے تحت نہیں آتے۔ کبھی ایک قاعدے کا ان پر اثر ہوتا ہے کبھی دوسرے قاعدے کا۔ اکثر مرکبات اس قسم کے ہیں۔ پانچ سات، آئے دن، تین پانچ کرنا وغیرہ ترکیبیں قاعدے کے مطابق وضع ہوتی ہیں۔ انھیں مفرد الفاظ اور مادوں کی طرح غیر قیاسی نہیں کہہ سکتے لیکن ان کا کوئی خاص لگا بندھا قاعدہ نہیں جس کو سامنے رکھ کر دوسری اسی نوع کی ترکیبیں وضع کی جاسکیں۔ "پانچ سات" کے معنی ہیں گنے چنے، یہ مرکب عطفی ہے۔ پانچ اور سات دو عدد ملا کر دیئے گئے ہیں اس کے قیاس پر "چھ آٹھ" یا "سات نو" جیسی ترکیبیں وضع نہیں کی جاسکتیں۔ "آئے دن" کے انداز پر "آئے روز" درست نہیں۔ "راتوں رات" سب بولتے ہیں "دنوں دن" بول چال کے خلاف ہے۔ تین پانچ کرنا کے معنی ہیں جھگڑا کرنا۔ یہ محاورہ اہل زبان کی گفتگو میں عام طور سے مستعمل ہے۔ اس کی وضع پر چار چھ کرنا یا پانچ سات کرنا ٹکسال باہر ہوگا۔

مرکب کی تین قسمیں ہیں۔ ایک مرکب وہ ہے جو زبان کے عام قاعدوں کے مطابق وضع ہوا اور اپنے عام ترکیبی معنوں میں استعمال ہو رہا ہے خواہ دو اسموں سے ترکیب پا کر بنا ہو جیسے باؤ گولا، جیب گھڑی، جنم پترا، گھر داماد، موم روغن، سفر خرچ، کفن چور یا اسم و امر کی ترکیب سے جیسے منہ توڑ، کفن کھسوٹ، پتھر توڑ، کھال اپاڑ، وغیرہ یا اسم و صفت کی ترکیب سے بنا ہو، جیسے جلتا منتر، اٹھتی جوانی، اندھیر نگری وغیرہ یا سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے جیسے ان گنا، برآمدہ، بے ڈول، گھڑیال، گھڑیال، کوڑیالا، ڈھیالا، متوالا، رکاوٹ، لگاوٹ، بچپن وغیرہ۔

یہ تمام مرکبات جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اپنے عام ترکیبی معنوں میں مستعمل ہیں۔ یہ سیدھے سادے مرکبات ہیں۔ اگر ان کے اجزائے ترکیبی کے معنی معلوم ہوں تو ان مرکبات کے معنی بھی معلوم ہو سکتے ہیں۔ مثلاً باؤ گولا کے معنی ہیں ہوا (ریاح) کا گولا۔ جیب گھڑی جیب میں رکھی جانے والی گھڑی ہے۔ موم روغن کے معنی ہیں موم اور روغن (تیل) یہ مرکب عطفی ہے۔ سفر خرچ = سفر کا خرچ کفن چور = کفن کا چور۔ جلتا منتر = جلتا ہوا منتر، باقی مرکبات کو انھی پر قیاس کر لیا جائے۔

ایک مرکب وہ ہے جو عام ترکیبی معنوں کے سوا کسی اور مجازی یا کنائی معنوں میں مستعمل ہے۔ "نیبو نچوڑ" کے معنی ہیں نیبو نچوڑنے والا۔ یہ کنایہ ہے متملق اور خوشامدی سے۔ مکھی چوس کے معنی ہیں مکھی کو چوسنے والا۔ عام بول چال میں مکھی چوس کنجوس ہے کہ مکھی سالن میں پڑ جائے تو سنی ہوئی انگلیوں کی طرح اسے بھی بے چوسے نہ چھوڑے۔ "اٹھتی کونپل" کے معنی ہیں چڑھتی جوانی۔ انمول

کے معنی ہیں قیمتی ۔ یہ مرکب کی پہلی قسم کی ایک ضمنی قسم ہے۔

مرکب کی تیسری قسم ان الفاظ پر مشتمل ہے جو خاص ترکیب و ترتیب کے ساتھ بولنے والوں کی زبانوں پر ہیں جیسے راتوں رات، چوری چھپے، خاک دھول، دھول دھپا، تیا پانچا۔

آخری دو قسم کے مرکبات کی یہ خصوصیت ہے کہ زبان میں عام طور سے یہ جس طرح مستعمل ہیں اور ان سے جو معنی مراد لئے جاتے ہیں ان میں کسی قسم کا تغیر، تصرف یا ردو بدل روا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ترکیبیں ٹھیک اسی طرح استعمال ہوں گی جس طرح اہل زبان نے ان کو استعمال کیا اور ان کے وہی معنی مراد ہوں جو اہل زبان مراد لیتے ہیں۔ نیبو نچوڑ کی جگہ رس نچوڑ یا نیبو ڈال کہنا اور خوشامدی کے سوا اس کے کوئی اور مناسب یا متعلق معنی مراد لینا درست نہیں۔ یہ لفظ اسی صورت میں استعمال ہوگا اور اس کے یہی معنی مراد لئے جائیں گے۔ یہی حال مکھی چوس کا ہے۔ اس کو مکھی خور یا مگس چیز یا اسی قسم کی کسی ترکیب سے بدلنا محاورے اور بول چال کے خلاف ہے۔

"انمول" ان (نافیہ) اور مول (قیمت) سے مرکب ہے اور اس کے معنی ہیں بیش قیمت۔ ہر چند "بے" "ان" کا ہم معنی ہے لیکن "بے مول" "ان مول" سے مختلف ہے۔ انمول کے انداز پر "ان جوڑ" درست نہیں اور بے جوڑ کے قیاس پر بے میل غلط ہے۔ انمل بے جوڑ کو بے مل ان جوڑ کہنا ایسا ہے جیسے تیری گھڑی میں کیا بجا ہے کو "تیری بجی میں کیا گھڑا ہے" بولنا۔

۲

روزمرہ اور محاورے کا تعلق مرکبات سے ہے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں :

"مفرد الفاظ کو روزمرہ یا بول چال یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا۔۔۔۔ بخلاف لغت کے کہ اس کا اطلاق مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو بمنزلہ مفرد کے ہیں، کیا جاتا ہے۔"

روزمرہ کے معنی ہیں روزانہ کا استعمال، اہل زبان کی بات چیت یا بول چال۔ یہ لفظ اردو میں محاورے کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ مولانا حالی نے غالباً سب سے پہلے روزمرہ اور محاورے میں فرق کیا۔ ان کے نزدیک روزمرہ عام ہے اور محاورہ خاص۔ ہر محاورہ روزمرہ ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر روزمرہ محاورہ بھی ہو۔ منطقی لحاظ سے ان میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے۔ روزمرہ کے لئے مولانا حالی نے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ :

۱۔ اہل زبان کی بول چال کے مطابق ہو۔

۲۔ اور قیاسی نہ ہو۔

روزمرہ خاص قسم کی بندھی ہوئی ترکیب ہے جو عام طور سے اہل زبان کی زبانوں پر سائر اور روزانہ کی بات چیت میں دائر ہو۔ مولانا نے روزمرہ کی حسب ذیل مثالیں پیش ہیں:

"اگر پان سات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو بولا جائے گا تو اس کو محاورہ[1] نہیں کہنے کے کیوں کہ اہل زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے یا مثلاً بلاناغہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ناغہ، ہر روز کی جگہ ہر دن، روز روز کی جگہ دن دن یا آئے دن کی جگہ آئے روز بولنا۔ ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا کیوں کہ یہ الفاظ اس طرح اہل زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔"

"اہل زبان کی بول چال" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک کوئی ترکیب اہل زبان کی بول چال میں عام طور سے مستعمل نہ ہو اور ہر شخص اسے برتتا نہ ہو، روزمرہ کہلانے کی مستحق نہیں۔ مولانا نے پان سات، سات آٹھ، ہر روز وغیرہ جو ترکیبیں مثال میں پیش کی ہیں، سب عام بول چال کی چیزیں ہیں اور عالم و عامی ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا نے "بلاناغہ" اور "بے ناغہ" کے فرق کو نظر انداز کر دیا۔ بلاناغہ متعلق فعل ہے جس کے معنی ہیں ناغہ کیے بغیر یعنی مسلسل، لگاتار اور بطریق استمرار۔ بے ناغہ ترکیب توصیفی ہے۔ بے کا خاصہ ہے کہ اسم پر داخل ہو تو اسے صفت بنا دے۔ بے علم جسے علم نہ ہو۔ بے وقوف جسے خبر نہ ہو۔ بے وفا جو وفادار نہ ہو۔ بے حیا جس میں حیا نہ ہو۔ اس کے قیاس پر بے ناغہ کے معنی ہوں گے جس میں ناغہ نہ ہو۔ یہ بدیہی طور سے غلط ہے۔ "زید بلاناغہ نماز پڑھتا ہے۔" اس جملے کا مطلب ہے زید کبھی نماز قضا نہیں کرتا برابر نماز پڑھتا ہے۔ "زید بے ناغہ ... ہے" بالکل بے معنی بات ہے۔ 'بلا' اردو میں بغیر قائم مقام ہے نہ کہ غیر کہ. بغیر کے معنوں میں 'لا' ہے اس لئے 'بلا' 'بے' کی جگہ نہیں لے سکتا۔

دوسری شرط روزمرہ کی یہ ہے کہ وہ قیاسی نہ ہو یعنی زبان کے عام اور مطرد قاعدوں کے مطابق وضع نہ کیا گیا ہو۔ وہ تمام ترکیبیں جو زبان کے کسی عام قاعدے کے تحت آتی ہیں روزمرہ کی تعریف اور اس کے حدود سے خارج ہیں۔ ان میں حسب قاعدہ ہر قسم کا تصرف کیا جا سکتا اور ان کے قیاس

---

[1] یہاں محاورہ عام معنوں میں ہے۔ آگے چل کر مولانا نے اس کو روزمرہ کا نام دیا ہے۔

پر دوسری ملتی جلتی ترکیبیں وضع کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً 'ہر' فارسی کلمہ ہے جو قواعد کے لحاظ سے ہر لفظ پر داخل ہو سکتا ہے۔ ہر شب، ہر ساعت، ہر آن، ہر دقیقہ، ہر مرد، ہر طفل، ہر زن، ہر کودک، ہر گھڑی، ہر در، ہر گھر، ہر لڑکا، ہر لڑکی وغیرہ یہ سب ترکیبیں قیاسی ہیں۔ ان کی وضع پر 'ہر' کی مدد سے بے شمار ترکیبیں وضع کی جاسکتی ہیں۔

مولانا حالی "ہر روز" کی جگہ ہر دن روزمرہ کے خلاف بتاتے ہیں۔ ہر روز کے دو استعمال ہیں ایک اسمی جیسے ہر روز کا آنا ؎

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

دوسرے متعلق فعل یعنی روزانہ، روز کے روز اور بلاناغہ۔ جیسے 'وہ ہر روز اسکول جاتا ہے' ہر روز اسمی کے قیاس پر ہر دن کی ترکیب درست ہے جیسے ہر دن دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ قیاسی ترکیب ہے اور زبان کے عام اور مطرد قاعدے کے مطابق وضع ہوئی ہے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے "ہر روز" خاص قسم کی بندھی ٹکی اور سکہ بند ترکیب ہے۔ یہ روزمرہ ہے۔ اس معنی میں اور اس کی جگہ "ہر دن" کہنا درست نہیں۔ ایک دو مثالوں سے اس کی مزید وضاحت ہوگی:

'بے' اور 'نا' نافیہ سابقے ہیں اور قریب قریب ہم معنی ہیں۔ استعمال میں خفیف سا فرق ہے۔ 'بے' اسم کے ساتھ خاص ہے۔ 'نا' اسم اور صفت دونوں پر داخل ہوتا ہے۔ 'بے' کے چند مرکبات: بے جان، بے راہ، بے سواد، بے پیر، بے شعور، بے علم، بے عقل، بے تنگ، بے خوف، بے قرار، بے لطف، بے قاعدہ، بے دخل، بے حواس۔

'نا' کے چند مرکبات: ناآشنا، ناامید، نابکار، نابالغ، نابینا، ناپائیدار، ناپسندیدہ، ناپید، ناراست، نادرست، ناروا، ناسازگار، نازیبا، نامرد، نازن، نامحرم۔

قاعدے کے مطابق 'بے' ہر اسم پر جگہ پاسکتا ہے اور 'نا' ہر صفت پر۔ نادرست کے قیاس پر مثلاً ناصحیح کہنا درست ہے۔ غیر صحیح اردو روزمرہ نہیں کہ اس میں تصرف نہ کیا جاسکے۔ یہ زبان کی عام قیاسی ترکیب ہے جس کے قیاس پر دوسری نئی ترکیبیں وضع کی جاسکتی ہیں اور نئی ترکیبیں زبان میں وسعت، بیان میں جدت اور اسلوب میں تازگی پیدا کرتی ہیں۔

ادیبوں اور شاعروں کی حسب قاعدہ وضع کردہ ترکیبوں کو جو عام بول چال میں نہیں آتیں، صرف ادبی نگارشوں اور شعروں میں برتی جاتی ہیں، روزمرہ نہیں کہتے۔ وہ زبان کے عام قاعدوں کے مطابق وضع ہوئی ہیں اس لیے ان کے قیاس پر دوسری نئی تراکیب وضع کی جاسکتی

ہیں اور خود ان کی ترکیبوں میں بھی قاعدے کے مطابق تصرف اور تغیر روا ہے۔ یہ وضع الفاظ ہے جس سے زبان نمو پاکر ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے۔ شعرا کے ان مرکبات کو ممی بنانا اور ان کی وضع پر ڈھلی ہوئی نئی ترکیبوں سے یہ کہہ کر اجتناب کرنا کہ یہ روزمرہ کے خلاف ہے انتہا درجے کی قدامت پسندی ہے۔

مولانا حالی نے روزمرہ کی جو مثالیں پیش کیں وہ عام اور کثیر الاستعمال ہیں کہ ہر شخص روزانہ گفتگو میں انھیں استعمال کرتا ہے اور غیر قیاسی بھی ہیں۔ پان سات روزانہ بول چال کی ترکیب ہے (پانچ کی جگہ پان مولانا نے عام بول چال کے مطابق لکھا ہے) قاعدے کے مطابق پانچ کے بعد چھ آنا چاہیے۔ "پانچ چھ" کی جگہ پانچ سات قیاس کے خلاف ہے۔ چھ کو بیچ سے نکال کر پانچ سات کہا جاسکتا ہے تو اس کے قیاس پر سات کو بیچ سے نکال "چھ آٹھ" کیوں نہیں کہہ سکتے۔ یہ ترکیب دو وجہ سے خلاف قیاس ہے۔ اولاً اس وجہ سے کہ اس ترکیب میں بیچ سے ایک عدد یعنی چھ بغیر کسی معقول وجہ کے حذف ہوا ہے۔ ثانیاً اس وجہ سے کہ اس کے قیاس پر "چھ آٹھ" نہیں کہتے۔ روز روز کی ترکیب بھی کسی قدر غیر قیاسی ہے۔ شب شب کوئی نہیں کہتا۔ صبح صبح اور شام شام بھی سننے میں نہیں آیا۔ "بار بار" البتہ بولتے ہیں لیکن بار اور روز میں فرق ہے۔ روز روز یعنی ہر روز یا روزانہ ایک خاص قسم کی ترکیب ہے جو اہل زبان کی زبان پر ہے۔

روزمرہ کے باب میں غیر قیاسی کے دو معنی ہیں۔ اول یہ کہ زبان کے عام رواج اور روایت سے ترکیب کی توجیہ نہ کی جاسکے جیسے پانچ سات، اٹھ بیٹھ، چھین جھپٹ۔ اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی جاسکتی کہ پہلی مثال میں درمیان سے چھ کیوں حذف ہوا اور مثال دوم میں اٹھ اور مثال سوم میں چھین بہ ترتیب بیٹھ اور جھپٹ سے پہلے کس لیے لائے گئے۔ دوسرے معنی غیر قیاسی کے یہ ہیں، اور یہ زیادہ عام ہیں کہ روزمرہ کی ترکیب و ترتیب زبان کے عام اور مطرد قاعدے کے تحت نہ ہو اور اس کے قیاس پر اس قسم کی دوسری ترکیبیں نہ بنائی جاسکیں۔ 'بن' اردو کا نافیہ سابقہ ہے جو بن سرا، بن مُرا، بن حیا، بن بیاہا وغیرہ میں استعمال ہوا ہے۔ سابقہ 'بے' کی طرح یہ عام اور مطرد نہیں کہ ہر لفظ پر داخل ہو سکے۔ 'بن سرا' درست ہے۔ 'بن چشما' غلط ہے۔ 'اُٹھ بیٹھ' اٹھنا بیٹھنا کے حاصل مصدر ہیں۔ ان کے قیاس پر 'چل پھر' نہیں 'چلت پھرت' کہیں گے۔ 'کھیل کود' سب کہتے ہیں، 'کھیلت کودت' کوئی نہیں کہتا۔ ڈڑھیالا (داڑھی سے)، مُنچھیالا (مونچھ سے)، مٹیالا (مٹی سے)، کوڑیالا (کوڑی سے)، عام بول چال میں ہیں۔ دانت سے 'دنتیالا نہیں' 'دنتیل' کہیں گے۔ 'ناک' سے 'نکیل' ہے اور اس کے

معنی ہیں ناک کی چیز یا ناک کا آلہ۔

"تھامنا" کے معنی ہیں پکڑنا۔ انسان سنبھلنے اور سہارا لینے کے لیے بھی دوسرے کو پکڑتا ہے اور دوسرے کو سنبھالنے اور سہارا دینے کے لیے بھی۔ آتش کا مصرع ہے ؎

تھامنا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا

تھام لینا سہارا لینا بھی ہے اور سہارا دینا بھی۔ مولانا تمنا عمادی نے قیاس سے کام لے کر "تھام لینا" کے معنی سہارا لینا تجویز کیے اور اور سہارا دینا کی مثال پر "تھام دینا" ایک نئی ترکیب وضع کر لی۔

دوش اعزہ سے کہیں، میرا جنازہ گر نہ جائے
بیٹھے ہو کیا اٹھو ذرا، ہاتھ لگاؤ تھام دو

اس پر حضرت نوح ناروی نے اعتراض کیا کہ "تھام دینا" اردو روزمرہ نہیں۔

بہادر شاہ ظفر نے ذیل کے مقطع میں تھام دینا استعمال کیا ہے اس کے باوجود یہ روزمرہ کے خلاف اور ٹکسال باہر رہے گا کہ یہ اہل زبان کی زبان پر نہیں تنہا ظفر کا استعمال اس کو اردو میں چلن نہ دے سکے گا:

اے ظفر دیکھیو اس آہ رسا نے اپنی
گنبد کہنۂ افلاک کو کیا تھام[1] دیا

۳

روزمرہ کو اردو زبان کے انشا پردازوں نے قیاس لغوی یا اصول صرف و نحو کے معنوں میں بھی عام طور سے استعمال کیا ہے۔ اس صورت میں اس کا تعلق صرف و نحو دونوں سے ہوگا۔ لفظ کا صرفی قاعدے کے خلاف استعمال، غیر متعارف اور اجنبی ترکیب فعل کے صلوں میں ردو بدل 'نہ' کی جگہ 'نہیں' اور اس کے برعکس 'نہیں' کی جگہ 'نہ'، مرکب مصدر میں غیر متعارف فعل کا لانا روزمرہ کے خلاف ہے مثلاً "میرے کو معلوم نہیں"۔ اس میں "میرے کو غلط ہے۔ غالب نے ایک جگہ چھٹویں (بجائے چھٹی) تاریخ لکھا ہے۔ یہ روزمرہ کے خلاف ہے۔ "ٹوپی اوڑھنا" اہل لکھنؤ نہیں بولتے۔ ان کے نزدیک یہ اردو کا روزمرہ نہ ہوگا۔ مولانا محمد حسین آزاد کا مصرع ہے:

طرے ہیں اعزاز کے جن لوگوں نے پائے ہوئے

---

[1] تھام دیا اگر روک دیا کے معنوں میں ہو تو یہ بالکل مختلف ترکیب ہوگی اور اس کا تعلق روزمرہ سے نہ ہوگا۔

ایک جگہ "قصص ہند" میں لکھتے ہیں :-

تم نے مجھے بادشاہ سمجھا ہوا تھا

ان میں 'نے' روزمرہ کے خلاف ہے۔

ایک جملہ ہے :

"بہت ہاتھ پانو مارے لیکن زیست کی کوئی صورت نہیں نکلی۔" یہاں "نہیں" کی جگہ "نہ" چاہیے۔ سودا کا شعر ہے :

آہ کس طرح تری راہ میں گھیروں کہ کوئی
سدِ راہ ہو نہ سکے عمر چلی جاتی کا

"راہ گھیرنا" (روکنا کے معنوں میں) روزمرہ نہیں اور "چلی جاتی عمر" نحو کے خلاف ہے۔ ذیل کے مصرع میں :

سایہ پڑا پڑا الب جو سرو بن گیا

"پڑا پڑا" کی جگہ "پڑے پڑے" روزمرہ ہے۔

مولانا نیر کاکوروی فرماتے ہیں : "جو جملے کی ترتیب یا الفاظ کا طریقہ استعمال اردو زبان میں مقرر ہے روزمرہ میں اس کی مطابقت لازمی ہے۔ (فقرہ) :

کیا کہوں سال بھر میں ایک بار بھی لکھنؤ جانے کا موقع نہیں ملا۔

اگر کوئی شخص کہے۔ سال بھر میں ایک بار بھی لکھنؤ جانے کا موقع نہ ملا تو روزمرہ کے خلاف ہوگا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں : "جس طرح خاص موقعے پر اہلِ زبان بے ساختہ الفاظ یا فقرے کہہ جاتے ہیں ان کو اسی طرح استعمال کرنا ضروری ہے۔ (آتش) :

کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے
ہم گنہ گار بے گناہ ہو تم

گنہ گار کا فعل حذف کرنا روزمرے کے مطابق ہے۔"

مولانا حالی کا ارشاد ہے :

"روزمرہ اور محاورے میں من حیث الاستعمال اور بھی فرق ہے۔ روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو تقریر و تحریر اور نظم و نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے، یہاں تک کہ کلام میں جس قدر روزمرہ کی پابندی کم ہوگی اسی قدر وہ فصاحت کے درجے سے ساقط سمجھا جائے گا۔ مثلاً "آج تک ان سے ملنے کا موقع نہ ملا۔"

یہاں نہ ملا کی جگہ نہیں ملا چاہیے۔ یا "وہ خاوند کے مرنے سے درگور ہوئی" یہاں زندہ درگور رہا چاہیے یا ع

سو گئے جب بخت تب بیدار آنکھیں ہو گئیں

یہاں ہو گئیں کی جگہ 'ہوئیں' چاہیے یا ع

دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا

یہاں کیا ہو گیا چاہیے۔"

اس تفسیر کی رو سے روزمرہ محاورے سے اہم ہو گا اور اس کا اطلاق گرامر یعنی صرفی نحوی قاعدوں، جملوں، ترکیبوں، فقروں اور محاوروں سب پر یکساں طور سے کیا جا سکے گا لیکن روزمرہ اپنے پہلے معنوں میں زیادہ مشہور ہے اور وضاحت بیان یا اصطلاحی الفاظ میں عدم ابہام اس امر کا مقتضی ہے کہ اسے محاورے کے بالمقابل معنی اول میں استعمال کیا جائے۔ اس بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ دیکھ لینا مناسب ہے کہ محاورے کے اصطلاحی معنی کیا ہیں تاکہ اس کے مقابلے میں روزمرہ کے مفہوم کی تعیین کی جا سکے۔

۴

محاورہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں گفتگو، بات چیت، بول چال۔ لغت کے لحاظ سے روزمرہ اور محاورہ قریب قریب ہم معنی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی کی توضیح اور روزمرہ محاورے کے اصطلاحی معنوں میں تمیز و تفریق کے باوجود اردو کے ادیب اور انشا پرداز محاورے کو روزمرہ کی جگہ اور روزمرہ کو محاورے کی جگہ استعمال کرنے سے نہیں جھجکتے اور جو اصحاب ان کے فرق و امتیاز سے آشنا ہیں وہ بھی اس باب میں تساہل یا سہل انگاری سے کام لیتے ہیں۔ اصطلاح میں محاورے کا اطلاق دو یا دو سے زیادہ الفاظ پر ہوتا ہے۔ اس کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:

"محاورے کا اطلاق خاص کر ان الفاظ پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"نقشہ اتارنا، نقل اتارنا، دل میں اتارنا، ہاتھ اتارنا، پینچا اتارنا، یہ سب

محاورے کہلائیں گے۔ کیوں کہ ان سب مثالوں اتارنے کا اطلاق مجازی معنوں میں کیا گیا ہے، یا مثلاً کھانا۔ اس کے حقیقی معنی کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اتارنے کے ہیں۔ مثلاً روٹی کھانا، دوا کھانا، افیم کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ ان سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہاں غم کھانا قسم کھانا، دھوکا کھانا، پچھاڑیں کھانا ٹھوکر کھانا، یہ سب محاورے کہلائیں گے۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ اسم و فعل کے مرکب کا نام محاورہ ہے بشرطیکہ فعل اپنے اصلی معنوں میں نہ ہو۔ "نقل اتارنا" محاورہ ہے۔ اس میں اتارنا کے اصلی معنی مراد نہیں۔ "غم کھانا" محاورہ ہے۔ اس میں کھانا مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک اور مقام پر مولانا حالی لکھتے ہیں:

"تین پانچ کرنا (یعنی جھگڑا ٹنٹا کرنا) اس کو محاورہ کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اس میں تین پانچ لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔"

اس سے ثابت ہوا کہ اسم و فعل کا وہ مرکب محاورہ ہے جس میں اسم مجازی معنوں میں ہو اور فعل حقیقی معنوں میں۔ "تین پانچ کرنا" میں ہر چند "کرنا" کے معنی نہیں بدلے، وہ اپنے اصلی معنوں میں ہے لیکن "تین پانچ" کے معنی بدل گئے۔ وہ اس ترکیب میں جھگڑے ٹنٹے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس اعتبار سے مولانا حالی کے نزدیک محاورے کی حسب ذیل دو صورتیں ہوئیں: ۱۔ اسم حقیقی معنی میں ہو اور فعل مجازی معنی میں، جیسے نقل اتارنا، سر اتارنا وغیرہ۔ ۲۔ اسم مجازی معنی میں ہو اور فعل حقیقی معنی میں جیسے تین پانچ کرنا۔ مولانا نے صرف ان دو صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی ہے، وہ یہ کہ اسم و فعل دونوں حقیقی معنوں میں ہوں لیکن یہ معنی مراد نہ ہوں بلکہ ایک نئے معنی جو دونوں کے مجموعے سے سمجھ میں آئیں مراد لیے جائیں۔ مولانا حالی کی بیان کردہ دوسری صورت حقیقت کے اعتبار سے اس تیسری صورت سے مختلف نہیں۔ شاید اس لیے مولانا نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سر اٹھانا (نافرمانی کرنا)، آگ پانی میں لگانا (شرارت کرنا)، آنکھ لڑانا (محبت کرنا)، بغلیں بجانا (خوش ہونا)، نو دو گیارہ ہونا (بھاگ جانا)، سر خم کرنا (اطاعت کرنا)، ہاتھ دھونا، منھ بنانا، اپنا الو سیدھا کرنا۔

ان مثالوں میں مرکب کے اصلی معنی اور ہیں اور مجازی معنی اور۔ یہ مرکبات جب بول چال

میں آتے ہیں تو ان کے غیر حقیقی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ لڑکے نے بہت سر اٹھا رکھا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اس نے سر اونچا کر رکھا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ حکم عدولی پر اتر آیا ہے اور کھلم کھلا نافرمانی کر رہا ہے۔ یہ تمام مرکبات محاورے ہیں۔ مولانا نیر کاکوروی لکھتے ہیں:

"جب ایک لفظ یا کئی لفظ مصدر سے مل کر حقیقی معنیٰ سے متجاوز ہو کر کچھ اور معانی دیں تو اس کو محاورہ کہتے ہیں۔ مثلاً پانی میں آگ لگانا یعنی مزاج کو بھڑکا دینا۔"

محاورے کی بنیاد دو چیزوں پر ہے' اولاً محاورہ اسم و فعل کا مرکب ہوگا جو دو اسموں سے ترکیب پائے یا ایک اسم اور ایک حرف سے، اسے اصطلاح میں محاورہ نہیں کہتے۔ ذیل کے مرکبات ملاحظہ ہوں:

برباد (تباہ)، پامال (ہلاک)، جاں باز (بہادر)، دلبر (محبوب)، خونخوار (وحشی)، خاکسار (متواضع)، گردن فراز (مغرور)، روسیاہ (گنہ گار)، ناگوار (ناپسند)، خوں آشام (قاتل)۔ یہ سب مرکبات مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جو قرینے میں درج ہیں لیکن فعل ان کا جزو نہیں اس لیے انھیں اصطلاح میں محاورہ نہیں کہیں گے۔

دوسرے محاورہ کبھی حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ محاورے کی روح استعارہ نہیں ہے۔ یہ درست نہیں، محاورے کی روح استعارہ نہیں، غیر حقیقی معنوں میں استعمال ہے۔ محاورے کی تین قسمیں ہیں اور تینوں اردو ادب میں مستعمل ہیں۔ پہلی قسم زیادہ عام اور کثیر الاستعمال ہے۔ اس کی بنا استعارہ یا کنایہ پر ہے۔ اس میں فعل کے اصل معنی مراد نہیں لیے جا سکتے اور وہ قرینہ ہوتا ہے اس امر کا کہ اسم کو ذہنی طور پر کسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نقش اتارنا اور ہوا کھانا میں اتارنا اور کھانا اس امر کا قرینہ ہیں کہ نقش گویا کپڑا ہے اور ہوا کھانے کی چیز۔ مولانا حالی محاورے کی اس قسم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور سے دیکھا جائے تو استعارے پر ہوتی ہے مثلاً جی اٹھنا۔ اس میں جی کو ان چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو سخت چیز پر لگ کر اچٹ جاتی ہیں، جیسے کنکر، پتھر، گیند وغیرہ یا مثلاً جی بٹنا۔ اس میں جی کو ایسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے جو منقسم اور متفرق ہو سکے۔ آنکھ کھلنا، دل کھلانا، غصہ بھڑکنا، کام چلنا اور اسی طرح ہزارہا محاورے استعارے پر مبنی

ہیں اور یہ وہ استعارے ہیں جن میں شعرا کی کارستانی کو کچھ دخل نہیں ہے بلکہ نیچرل طور پر بغیر فکر اور تصنع کے اہل زبان کے منہ سے وقتاً فوقتاً نکل کر زبان کا جزو بن گئے ہیں۔"

استعارے سے مولانا حالی کی مراد غالباً اس کی ایک قسم استعارہ بالکنایہ ہے۔ اس لیے کہ استعارہ بالتصریح میں محاورہ بننے کی صلاحیت نہیں:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

"شیر" بہادر انسان کے معنیٰ میں استعمال ہونے کے باوجود محاورے کی حیثیت حاصل نہ کر سکا۔ اوپر کی سطروں میں جن مجازی مرکبات کا ذکر ہوا ان میں سے کوئی بھی محاورہ نہیں۔ وہ سب مجازی ترکیبیں ہیں جن میں سے کچھ کا تعلق استعارے سے ہے اور کچھ کا کنائے سے ان کے ساتھ فعل ہو تو وہ اپنے حقیقی معنوں میں ہوگا اور یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اسم مجازی معنی میں ہو اور فعل حقیقی معنی میں تو یہ مرکب صرف اس صورت میں محاورہ کہلائے گا کہ فعل کے ساتھ مل جل کر کوئی نئے معنی ادا کرے۔ بر باد کرنا، پامال کرنا، جاں بازی دکھانا، روسیاہ ہونا، ناگوار ہونا، خوں آشام ہونا۔ ان مثالوں میں سے کسی کو بھی محاورے کا درجہ حاصل نہیں۔ اگرچہ ان کا جزو اول یعنی اسم مولانا حالی کے لفظوں میں "اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔"

دوسری قسم کے محاورے میں ارسال پایا جاتا ہے جو مجاز کی ایک قسم ہے اور جسے اصطلاح میں مجاز مرسل کہتے ہیں۔ جیسے سڑک چل رہی تھی۔ پرنالے بہہ رہے تھے۔ استعارے کی اس صنف کا ذکر مولانا حالی نے نہیں کیا۔

یہ دونوں قسمیں استعارے کی مذکورہ بالا پہلی صورت میں شامل ہیں۔ ان میں فعل اصلی معنوں سے ہٹ کر مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

محاورے کی تیسری قسم کا کنائے سے تعلق ہے۔ اس میں اسم و فعل کے حقیقی اور غیر حقیقی معنوں میں کچھ اس طرح کا رشتہ ہوتا ہے کہ حقیقی معنوں سے (جو مراد نہیں ہوتے) غیر حقیقی یعنی کنائی معنوں کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ سر اٹھانا کے حقیقی معنی ہیں سر اونچا کرنا۔ یہ بغاوت اور سرکشی کی علامت ہے اور "سر خم کرنا" کے اصلی معنی ہیں سر جھکانا۔ یہ اطاعت کی دلیل ہے۔ اس لیے سر اٹھانا سے بغاوت کی طرف ذہن منتقل ہوگا اور سر خم کرنا سے اطاعت اور فرمانبرداری کی طرف۔ یہ کنایہ ہے۔ اوپر جو مثالیں درج ہوئیں وہ سب کنائے کی ہیں جن میں ان کے کنائی معنی مراد لیے

گئے ہیں۔ مولانا حالی نے اس نکتے کی طرف مختصر طور سے ذیل کی عبارت میں اشارہ کیا ہے:

"کنایہ بھی زیادہ تر محاورات ہی کے ضمن میں استعمال ہوا ہے۔"

۵

محاورہ اصطلاح میں اسم و فعل کا مرکب ہے بشرطیکہ فعل کے اصلی معنی مراد نہ ہوں یا مجموعہ نئے مجازی یا کنائی معنی میں مستعمل ہو۔ اس کے علاوہ اسم و فعل کے جملہ مرکبات روزمرہ ہیں لیکن اس کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ اسم و فعل کی ترکیب کو گتے بندھے مرکب کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ دو چار مثالیں پیش کرتا چلوں۔ کپڑے اتارنا، ٹوپی پہننا (لکھنؤ میں) ٹوپی اوڑھنا (دلی میں) تھام لینا، مدد دینا، ہوا چلنا، بیج بونا، درخت لگانا، دھوپ دینا، پانی دینا وغیرہ۔

میری رائے ہے کہ قیاس لغوی، بول چال، روزمرہ، محاورہ یہ الفاظ اصطلاح کے طور پر خاص خاص معنوں میں استعمال کیے جائیں اور ان میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ نہ برتا جائے۔ زبان کے عام قاعدوں کو قیاس لغوی کہا جائے اور خاص خاص استثنائی قاعدوں کو بول چال۔ غیر قیاسی مرکبات اور مرکب مصادر پر روزمرہ کا اطلاق ہو لیکن ان مصادر کی بنا اگر مجاز اور کنائے پر ہو تو انھیں محاورہ کہا جائے۔ میری یہ تجویز ایک حد تک مولانا حالی، دوسرے اہل علم اور انشا پردازوں کی تحقیق کے مطابق ہے اس لیے اس کے اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اس میں ایک فائدہ متصور ہے کہ اس پر عمل کرنے سے زبان میں استحکام پیدا ہوگا اور فنی و ادبی استواری آئے گی جو الفاظ و اصطلاحات کے استعمال میں یکسانی کے بغیر کبھی نہیں آتی۔

ترادفی مرکبات

اردو میں مرکب کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں ایک مرکبِ عطفی بھی ہے جسے سنسکرت میں "دوند سماس" کہتے ہیں۔ یہ ایک حیثیت کے دو کلموں کی ترکیب سے وجود میں آتا ہے جن کے درمیان حرفِ عطف "اور" نہیں ہوتا۔ جیسے: کام دھام (= کام اور دھام)، تانا بانا (= تانا اور بانا)، بھلا چنگا (= بھلا اور چنگا)، تاک جھانک (= تاک اور جھانک)، توڑ جوڑ (توڑ اور جوڑ)، بھولا بھٹکا (= بھولا اور بھٹکا) وغیرہ۔

اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ مرکب کے دونوں کلمے معنی کے اعتبار سے مختلف ہوں۔ جیسے ادھیڑ بن، ہار جیت، لیا دیا، لپا پتا، تانا بانا، توڑ جوڑ وغیرہ۔ عموماً یہ کلمے ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہے۔

۲۔ دونوں کلمے ہم معنی ہوں۔ جیسے:

خاک دھول، تاک جھانک، کاٹ چھانٹ، اچھل کود، کتر بیونت، پالا پوسا، بھولا بھٹکا، رچ بس وغیرہ۔

مولانا وحید الدین سلیم مرکب کی اس قسم کو مرکب ترادفی کے نام سے یاد کرتے ہیں (وضع اصطلاحات ص ۲۳۸)۔ مہمل اور موزوں اس کی دو قسمیں ہیں۔ مہمل میں مرکب کا دوسرا جز، جسے تابع کہتے ہیں بے معنی ہوتا ہے۔ یہ مفہوم میں عموم پیدا کرنے کے لیے جزو اول کے پہلے حرف کو 'و' سے بدل کر ایک بے معنی لفظ وضع کر لیتے ہیں اور اسے مرکب کا دوسرا جز قرار دے کر کہتے ہیں۔ روٹی ووٹی، پانی وانی، لٹھا وٹھا وغیرہ۔ انشا نے دریائے لطافت میں (۹۶-۱۹۵) مرکب کی اس قسم کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مہمل ہندی بہ ترتیب حرف اول ہر لفظ با معنی، با وزارت (و) باشد مثل

گھوڑا دوڑا اور لٹا وٹا اور آگ واگ اور گیہوں ویہوں اور چناونا اور پانی وانی ۔"

یہ "و" غالباً عربی "وغیرہ" سے تراشا گیا ہے۔ لٹھا وٹھا کے معنی ہیں لٹھا وغیرہ۔ کسی کو بازار سے لٹھا خریدنا ہو تو وہ یہ نہ کہے گا کہ مجھے لٹھا لینا ہے۔ یہ بدشگونی ہوگی۔ اس لیے کہ لٹھا کفن کے لیے بھی خریدا جاتا ہے۔ لٹھے کے ساتھ وٹھا اضافہ کر کے کہا جائے گا لٹھا وٹھا خریدنا ہے۔

فارسی توابع کے زیر اثر جہاں 'و' کی جگہ 'م' ہوتا ہے اردو کے بعض کلموں میں 'م' دیکھا گیا ہے۔ جیسے: جھوٹ موٹ، پیچ میچ۔ یہ کلمے بھی مرکب ترادفی مہمل شمار کیے جائیں۔

مرکب ترادفی کی دوسری قسم موضوع کا استعمال اردو میں زیادہ ہے۔ یہ اردو کی خصوصیت ہے جو اردو کی سرشت کے ایک پہلو کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سے پہلے اس کی دو قسموں کا ذکر ضروری ہے۔ پہلی قسم ان مرکبات کی ہے جن کے دو کلموں کو "ا" (الف ساکن) سے ملا دیا گیا ہو۔ جیسے:

جھڑا جھڑ، دھما دھم، پھٹا پھٹ، جھما جھم، جھلا جھل، چھما چھم، شپا شپ، کھٹا کھٹ، دھڑا دھڑ، کھنا کھن، چھنا چھن وغیرہ۔

مرکب کی یہ وضع حکائی کلمات کے ساتھ خاص ہے۔ "ا" صوتی تسلسل کو ظاہر کرتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ فارسی کے الف اتصال سے لیا گیا ہے۔

دوسری قسم میں وہ مرکبات آتے ہیں جن کے دو کلموں کے درمیان 'م' ہے۔ یہ 'م'، اگر سنسکرت کے بے جنس کلموں کی علامت 'م' کا نمائندہ نہیں تو عربی دو زبر یعنی تنوین منصوب کا قائم مقام ہوگا۔ جیسے:

کشتم کشتا، لٹھم لٹھا، ٹالم ٹول، ٹھوسم ٹھانس، گھوسم گھانس، دھکم دھکا، ٹھیکم ٹھاک، پورم پور وغیرہ۔

ان مرکبات کی ایک خصوصیت ہے وہ یہ کہ مرکب کے پہلے جز کے درمیان اگر 'و' یا 'ی' میں سے کوئی حرف ہے تو جزو ثانی کا درمیانی حرف 'ا' ہوگا۔ جیسے:

گھولم گھال، گھوسم گھانس، ٹھوسم ٹھانس، ٹھیکم ٹھاک، جیم جاک۔ اس کے برعکس اگر جزو اول میں 'ا' ہے تو اس کے مقابل جزو ثانی میں 'و' ہوگا جیسے: ٹالم ٹول، گھالم گھول وغیرہ۔

اردو اپنی فطرت میں موسیقیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس نے الفاظ اور تراکیب دونوں میں آہنگ اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں دیا۔ مرکب ترادفی کی حسب ذیل پانچ قسمیں ہیں جن میں سے ہر ایک میں ایک قسم کا توازن ہے۔

۱۔ مرکب تکراری۔ اس کی دو صورتیں ہیں :

(الف) مرکب جزو اول یعنی متبوع کو جوں کا توں دہرا دیا جائے۔ یہ حکائی الفاظ کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے اجزا عموماً احادی المقطع یعنی یک رکنے ہوتے ہیں۔ جیسے :

کھٹ کھٹ، پھٹ پھٹ، ٹپ ٹپ، کھل کھل، بھن بھن، جھپ جھپ، جھن جھن، دھم دھم، سن سن، بھڑ بھڑ، واہ واہ، بھوں بھوں۔

(ب) جزو اول کی درمیانی حرف علت کو (و، ی) 'ا' سے بدل کر مرکب کا جزو ثانی بنایا جائے۔ جیسے :

بوجھ باجھ، بیٹھ باٹھ، بھیڑ بھاڑ، پوچھ پاچھ، تول تال، دیکھ داکھ، دھوم دھام، ڈھونڈ ڈھانڈ، چھیڑ چھاڑ، سوچ ساچ وغیرہ۔

مادے کی درمیانی حرکت کو کھینچ کر اردو میں فعل لازم سے فعل متعدی بنا لیتے ہیں۔ بعض مرکبات اردو میں لازم اور اس کی متعدی شکل کی تکرار سے وضع ہوئے تھے۔ جیسے: پڑھ پڑھا، رکھ رکھاو، چل چلاو وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا مرکبات جن کے جزو ثانی میں 'ا' ہے لازم و متعدی کے قیاس پر یہ سمجھ کر وضع ہوئے گویا ان کا دوسرا جز پہلے جز کا تعدیہ ہے۔ یعنی متبوع لازم ہے اور تابع متعدی۔ داکھ دیکھ کا تعدیہ ہے اور باٹھ بیٹھ کا۔

۲۔ اتلی جوڑے جن کے پہلے حرف کو چھوڑ کر باقی تمام حروف مشترک ہوں۔ جیسے :

اور چھور، پکڑ دھکڑ، تاک جھانک، توڑ پھوڑ، ٹوٹ پھوٹ، چمک دمک، رس بس، رل مل، ریل پیل، کاٹ چھانٹ، لپ جھپ، لپک جھپک، لڑائی بھڑائی، مانگا تانگا (تانگا = مانگا)۔

۳۔ ایک حرف سے شروع ہونے والے کلموں کے مرکبات۔ جیسے :

میل ملاپ، پاس پڑوس، در ودار، دھن دولت، کام کاج، گھن گرج، دن دھاڑے (دھاڑے = دن میں)، ڈھور ڈنگر، ڈھول ڈھمڑا، دوڑ دھوپ۔

۴۔ مختلف لیکن ہم معنی لفظوں کے جوڑے۔ جیسے :

بھائی بندھو (بندھو = عزیز)، گھر بار (بار = دروازہ)، دیکھ بھال (بھالنا = پرکھنا)، بھلا چنگا (چنگا = تندرست)، بھول چوک، میل جول (جُلنا = ملنا)، اکھاڑ پچھاڑ، جھاڑ پھونک، جھاڑ پونچھ، چلت پھرت، چھان بین (بیننا = صاف کرنا)، روک تھام، کتر بیونت، لوٹ کھسوٹ، جلی کٹی، سکھائی بجھائی وغیرہ۔

اس کے بعض الفاظ قدیم اور متروک ہونے کے باعث بظاہر بے معنی اور مہمل نظر آتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ بامعنی ہیں جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہوگا۔

۵۔ اس کے دو ضمنی اصناف ہیں جن میں سے پہلی صنف کے مرکبات جزو اول "ا" (الف مفتوح) سے شروع ہوتا ہے اور جزو ثانی س یا ٹ سے۔ دوسری صنف کے مرکبات کے جزو اول کے شروع میں 'ا' ہوتا ہے اور جزو ثانی کے شروع میں کوئی دوسرا حرف۔ صنف اول کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

اٹ سٹ، انٹ سنٹ، اناپ شناپ، اگڑم سگڑم۔

صنف ثانی کی مثالیں:

اختر بختر، اڑوس، پڑوس، انجل لنجل، الول جلول، الم غلم، اینڈا بینڈا، ادل بدل، آس پاس، الگ تھلگ، آنا پتا وغیرہ۔

اس سلسلے میں یہ امر بہرحال پیش نظر رہنا چاہیے کہ ان مرکبات کے جزو اول کا 'ا' قافیہ ہے اور س' اتباتی۔ اناپ کے معنی ہیں بے ناپے یعنی بے اندازہ شناپ کے معنی ہیں ناپ اور اندازے کے ساتھ یعنی حد اور قیاس کے مطابق۔ صنف ثانی کے مرکبات بھی اس روش پر جزو اول میں 'ا' اضافہ کرکے بنائے گئے ہیں اور سب قریب قریب بامعنی ہیں۔ ان میں 'ا' سے شروع ہونے والا کلمہ عموماً پہلے آتا ہے اور اسے تابع سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ تابع ہو۔ متبوع بھی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ الگ تھلگ میں الگ (سنسکرت الگن = جدا) اصل کلمہ ہے۔ اسے متبوع ہونا چاہیے۔ تھلگ اس کا تابع ہے۔

ان کلموں کا 'ا' زائد ہے، اس لیے وہ مرکبات جن کا 'ا' اصلی ہے اس قسم میں شامل نہ ہوں گے۔ جیسے: اب تب، ات گت وغیرہ۔

عام خیال یہ ہے کہ ان مرکبات کا جزو اول یا دوم بے معنی ہوتا ہے جسے تابع مہمل کہتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ ان مرکبات کے دونوں اجزا بامعنی ہیں۔ متقدمین میں سے سید انشا نے ان کو بامعنی قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہر دو لفظ باہم استعمال پذیر و جدا جدا ممنوع نیست۔ مانند کلا ٹھلا، ملا لا بالا، تانا بانا اگر کسے بگوید کہ دریں ہر سہ لفظ مذکور لفظ دوم مہمل، لفظ اول است غلط می گوید۔" (دریائے لطافت صفحہ ۱۹۵)

روٹی ووٹی جیسے مرکبات کے علاوہ اردو کی ہر ترکیب بامعنی ہے۔ کبھی اپنی بے خبری کے باعث اردو کی بعض ترکیبوں کو ہم مہمل کہہ دیتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں۔

دخیل الفاظ

دخیل الفاظ سے مراد اجنبی الفاظ جو اردو نے کسی زبان سے مستعار لے کر اپنائے اور اردو میں اردو الفاظ کی حیثیت سے عام طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ دخیل الفاظ کے لیے اپنانا ضروری ہے۔ جب تک یہ اجنبی الفاظ عام طور سے استعمال نہ ہوں۔ زبان میں اچھی طرح رچ بچ نہ جائیں اور دوسرے الفاظ کے ساتھ گھل مل کر ایک نہ ہو جائیں انھیں دخیل الفاظ کا درجہ حاصل نہ ہوگا۔

تت سم اور تدبھو ان کی دو قسمیں ہیں۔ جو الفاظ لفظی یا صوتی تصرف کے بغیر جوں کا توں اردو میں لے لیے گئے وہ تت سم ہیں اور جنھیں اردو نے جنتر پر چڑھا کر اپنی سرشت کے مطابق ڈھال لیا انھیں تدبھو کہتے ہیں۔ تت سم اور تدبھو کی اصطلاحیں لسانیاتی ادب میں عام طور سے مستعمل ہیں۔ اور بظاہر اس کی ضرورت نہیں کہ انھیں اردو میں منتقل کیا جائے لیکن اردو لفظ مستعار تت سم کا ہم معنی ہے اور دخیل تدبھو کا۔ اس لیے تت سم اور تدبھو جیسی خالص سنسکرتی نامانوس اصطلاحوں کی جگہ آیندہ میں مستعار اور دخیل استعمال کروں گا کہ یہ مقابلتاً آسان بھی ہیں اور عام فہم بھی اور کسی مزید شرح و توضیح کے بغیر اپنا مفہوم ادا کر دیتے ہیں۔

اردو میں مستعار اور دخیل دونوں قسم کے الفاظ کی بڑی تعداد ہے۔ یہ اردو کی فطرت ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنی پرائی ہر زبان سے استفادہ کیا اور جب ضرورت سمجھی دوسری زبان کا لفظ لے کر اپنے ذخیرے میں شامل کر لیا۔ اس طرح بول چال کی زبان سے ترقی پا کر اس نے ایک اعلیٰ علمی اور تہذیبی زبان کا درجہ حاصل کیا۔ اردو میں عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی، پرتگالی، انگریزی الفاظ بھی ہیں اور تلگو، تامل، کنڑی وغیرہ زبانوں کے الفاظ بھی لیکن آخر الذکر زبانوں کے الفاظ مقابلتاً زیادہ قدیم ہیں۔ اس امر کی تاریخی اور لسانیاتی شہادتیں موجود ہیں کہ یہ الفاظ اردو کی

موجودہ شکل اختیار کرنے سے پہلے اردو میں آئے اور ان کا بڑا حصہ ایسا ہے جو اردو نے براہ راست ان زبانوں سے نہیں لیا بعض دوسری زبانوں کے واسطے سے اردو میں درآمد ہوا ہے۔ یہ الگ بحث ہے جس پر میں اس فرصت میں اظہار خیال نہ کرسکوں گا۔

دخیل الفاظ کے مقابلے میں مستعار الفاظ کی تعداد اردو میں زیادہ ہے اور یہ قریب قریب ہر زبان کے ہیں۔ ان میں سے بیشتر حال کی پیداوار ہیں یعنی مولد ہیں۔ اردو میں آئے انھیں زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ان میں سے جو قدیم ہیں وہ عام بول چال سے زیادہ، کتابوں، رسالوں، علمی و ادبی تحریروں میں استعمال ہو رہے ہیں اور زبان کا جز ہونے کے باوجود زبان میں رچ بچ کر گوشت پوست کی حیثیت حاصل نہیں کرسکے ہیں۔ انھیں اردو لغات اور فرہنگوں میں دیکھا جاسکتا اور بآسانی دریافت کیا جاسکتا ہے کہ یہ الفاظ کس زبان کے ہیں۔ البتہ دخیل الفاظ کے بارے میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اردو نے ان میں کیا کیا لفظی تصرفات کیے اور ان سے اردو کی فطرت کا کون سا پہلو بے نقاب ہو کر سامنے آتا ہے۔

اردو ع، ح، ہ (ساکن) سے پہلے حرف کی حرکت کا تلفظ عموماً خفیف اور مجہول انداز میں کرتی ہے۔ زیر کا تلفظ "اے" (یائے مجہول) کے کسرے کی طرح ہوتا ہے، زبر کا تلفظ "اے" (یائے لین) کے فتحے کی طرح اور پیش کا "او" (واو مجہول) کے ضمہ کی طرح۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اعتماد، اہتمام، احتیاط، محنت، احمد، محمود، معاملہ، مہل، معاہدہ، عہدہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ جن الفاظ میں کسرے کے بعد اور اس سے متصل فتحہ ہے اردو میں کسرے کا تلفظ "اے" کے زیر کی طرح ہوگا۔ جیسے:

اجتناب، اشتمال، اجتہاد، صفات، جہاد، بلاد وغیرہ۔ اہل اردو کسرے کو فتحے سے بدل کر اجتناب (بکسرہ ت) کو اجتناب (بفتحہ ت)، اشتمال (بکسرہ ت) کو اشتمال (بفتحہ ت) اور اجتہاد (بکسرہ ت) کو اجتہاد (بفتحہ ت) بھی کہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں کسرہ حذف ہوگیا ہے۔ جیسے:

نادرہ (بسکون د)، راشدہ (بسکون ش)، خالدہ (بسکون ل)، باب مفاعلہ کے قریب قریب تمام مصادر جو عالم و عامی ہر شخص کی زبان پر ہیں فتحے کے تسلسل کی وجہ سے اول اول اردو میں 'ع'[1] کے کسرے کے ساتھ بولے گئے۔ جیسے:

مشاہدہ، مجادلہ، مناسبت، مشارکت، مضاربت وغیرہ اور آخر آخر توالی حرکات کے باعث پہلی

[1] یعنی اس حرف کے کسرے کے ساتھ جو مفاعلہ کے "ع" کی جگہ ہے۔ مشاہدہ کی "ہ"۔

حرکت حذف ہوگئی چنانچہ آج عام بول چال میں مجادلہ، مناسبت، مشارکت وغیرہ الفاظ ع، کلمے کے سکون کے ساتھ رائج ہیں

اس مسئلے کا تعلق آہنگ سے ہے جو اردو کی فطرت ہے۔ اردو سہ حرفی لفظوں کی حرکات کا تواتر کسی نہ کسی طرح گوارا کر لیتی ہے۔ چہار حرفی یا پانچ حرفی لفظوں میں حرکات کی توالی اسے ناگوار ہے۔ چنانچہ سہ حرفی اسمار پر جن کا درمیانی حرف متحرک ہے، اگر ای، یا او، وغیرہ کوئی حرف اضافہ کیا جائے تو اردو میں ان کے درمیانی حرف کی حرکت گر جائے گی تاکہ لگاتار دو حرکتیں یکجا نہ ہوں، جیسے:

غلط سے غلطی، نظر سے نظروں، محل سے محلوں، بشر سے بشریت، اہم سے اہمیت وغیرہ۔

دریائے لطافت (ص ۳۰۶) میں ہے:

"ہم چنیں بعضے حروف متحرک را ساکن سازند مانند بشریت بسکون شجاعت (= ش)... محل و نظر را کہ حرف اوسط شاں مفتوح است وقت جمع ساکن الاوسط خوانند مثل نظروں میں اور محلوں میں"

ان لفظوں میں دوسرے حرف کے ساکن کرنے کی وجہ سے دو دو حرفوں کے دو یا دو سے زیادہ ایک جیسے ہم وزن اور ہم آہنگ رکن یا لفظی جوڑے وجود میں آتے ہیں جو بولنے میں یک رنگ و ہم آہنگ محسوس ہوتے ہیں۔ اس طور پر:

غلطی (= غل + طی)، نظروں (= نظ + روں)، محلوں (مح + لوں)، بشریت (= بش + ری + یت)، اہمیت (= اہ + می + یت)، وغیرہ وغیرہ۔

اسم فاعل کے صیغے جن میں "ا" کے بعد ہمزہ ہے۔ اردو میں غالباً "پایل" جیسے اردو الفاظ کے قیاس پر عموماً ہمزہ کی جگہ "ی" مفتوح سے بولے جاتے ہیں۔ جیسے:

مایل، قایل، حایل، رایج وغیرہ۔

مختلف جنس کی دو صحیح مصمت آوازوں کا اختلاط اردو کے مزاج کے خلاف تھا۔ چنانچہ غیر زبان کے جن الفاظ میں دو صحیح آوازوں کا تال میل تھا ان میں سے ایک کو متحرک کر کے اردو نے ان الفاظ کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا۔ عربی و فارسی کے حسب ذیل الفاظ جو اصلاً ساکن الاوسط ہیں اردو میں متحرک الاوسط بولے جاتے ہیں۔

شرم، گرم، نرم، عقل، شکل، نکہ، قبر، اجر، فخر، صلح وغیرہ۔

دریائے لطافت (ص ۳۰۵) میں ہے:

"بر طالبان مخفی مباد کہ بعضے الفاظ عربی و فارسی کہ مرکب از سہ حرف است و حرف اوسط شان ساکن در اردو بحرکت آں حرف استعمال یافتہ اند، مانند شرم و گرم و کبر و نرم و صبر و علم و ظلم و عقل و قبر و جبر و شکل و فکر و اجر و فخر و صلح۔

یہ اردو زبان کا عام رجحان ہے۔ عام اردو بولنے والے ان الفاظ کے درمیان حرف کو متحرک کرکے بولتے ہیں۔ جو اہل علم اردو زبان کے عام رجحان کے خلاف ان الفاظ کو عربی فارسی قواعد کے مطابق تلفظ کرتے ہیں ان کے بارے میں انشا نے بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ قابلیت پناہ اور فضیلت دستگاہ لفظ کے استعمال سے سروکار نہیں رکھتے۔ بزعم خود تحقیق کا حق ادا کرتے ہیں۔

"پیداست کہ الفاظ مذکورہ کہ ہم بروزن برف یا حرف یا شکر اند در اردو متحرک الاوسط بہ تلفظ در آرند سوائے روزمرہ بعضے قابلیت دستگاہاں کہ باستعمال لفظ سروکار نداشتہ قدم براہ تحقیق می زنند۔"

انگریزی کے جن الفاظ کی ابتدا دو صحیح آوازوں سے ہوتی تھی اردو نے اپنے عام رجحان کی رعایت سے ان کے شروع میں الف وصل مکسور اضافہ کرکے انھیں ہلکا بنایا۔ جیسے:

اسکول، اسٹول، اسٹیشن، اسٹو، اسٹینڈ وغیرہ۔

وسط یا آخر کلمے میں بھی دو حرف صحیح کا اجتماع اردو کو گوارا نہ تھا چنانچہ پہلے حرف کو اس نے متحرک کر لیا۔ جیسے:

کانسٹیبل سے کانسٹبل، کورٹ سے کورَٹ، گارڈ سے گارَد یا دونوں میں سے ایک کو گرا دیا۔ جیسے:

رپٹ (رپورٹ)، لاٹ (لارڈ)، پاٹ (پارٹ)، لالٹین (لینٹرن)۔

"ے او" گراں قسم کا مصوتہ ہے۔ اردو اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس نے اس مصوتہ کو "ے و" کی شکل دی۔ جیسے:

رونڈ (بجائے راونڈ)، پونڈ (بجائے پاونڈ)، ہوس (بجائے ہاوس) کا بخی ہوس میں جس کی اصل کیٹل ہاوس ہے۔

ٹ، ڈ وغیرہ ملفوظی آوازیں اردو میں پہلے سے موجود ہیں۔ اس کے باوجود انگریزی الفاظ کی "ٹ" کو اردو میں "ت" کی شکل اختیار کرنی پڑی اور ڈ نے د کا روپ دھارا۔ جیسے:

کپتان (کیپٹن)، توس (ٹوسٹ)، بوتل (بوٹل)، روند (راؤنڈ)، برانڈہ (ورانڈا)، گارد (گارڈ) وغیرہ۔

اردو الفاظ کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے اس لیے:

۱۔ عربی کے جو الفاظ ہمزہ پر ختم ہوتے ہیں ان کے آخر سے ہمزہ گرا دیا گیا۔ جیسے:

ارتقا، اشتہا، انشا، ضیا، ضو، شئے وغیرہ

۲۔ مشدد حروف مخفف کر لیے گئے۔ جیسے:

سر، دُر، انسانی، حیوانی، صف وغیرہ

شاید اس لیے عربی کا لاحقہ اسم کیفیت "یۃ" (بہ شدی) اردو میں "یت" (بہ تخفیف ی) ہے۔

جیسے: انسانیت، حیوانیت، رسانیت وغیرہ۔

لیکن اہل علم بدستور 'ی' کو مشدد ادا کرتے ہیں۔

حرف صحیح ساکن کے بعد 'و' کا تلفظ اردو والوں کے لیے مشکل ہے اس لیے وہ جزو کو جز اور کفو کو کف کہتے ہیں۔ بعض اہل علم نے بھی جزو کو (جب ترکیب میں نہ ہو) جز لکھا ہے۔ اسی طرح ح اور ع کا حرف علت کے بعد اردو میں تلفظ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ صحیح، تسبیح، اشباع، ارتفاع وغیرہ کلمے اردو میں صحی، تسبی، اشبا، ارتفا بولے جاتے ہیں۔ قدیم دکنی میں صحیح کو صحی اور تسبیح کو تسبی لکھا جاتا تھا۔ "سہی" (عربی صحیح) اردو کے اس رجحان کی بھولی بسری یادگار ہے۔

ترکی الفاظ میں اردو نے جو تصرفات کیے ان میں سے چند کو ایک عام رجحان کی حیثیت حاصل ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ کلمے کے آخری 'ے' کو 'ا' (یا ہ) سے بدل دیا گیا۔ جیسے:

تکمہ (تکمے)، آکا (آکے)۔

۲۔ ماقبل آخر زیر یا پیش زبر ہو گیا۔ جیسے:

خانم (خانُم)، بیگم (بیگُم)۔

۳۔ 'اُو' اگر کھینچا نہیں گیا تو پیش سے بدل دیا گیا۔ جیسے:

جوق جوق (جُوق جُوق)، کورچ (کُورچ)، دلہا (دُولھا)۔

یائے نسبت اردو میں

نسبت کی "ی" (ے،ی) اردو میں تین قسم کی ہے۔ ایک عربی کی ہے۔ عربی کی مشدد تھی اردو میں آکر مخفف ہو گئی۔ جیسے: دہلوی، سوداوی، مذہبی، عائلی، اسرائیلی، کسبی، فطری۔ دوسری فارسی سے آئی جیسے: آتشی، دوزخی، نہانی، ابری، ابریشمی۔ تیسری خاص اردو کی ہے۔ اردو میں لفظ کے آخر میں "ی" بڑھا کر نسبت کے معنی لیتے ہیں۔ جس اسم کے آخر میں "ی" بڑھائی جاتی ہے وہ صفت ہو جاتا ہے۔ جیسے:

اچاپتی، اساڑھی، آڑھتی، پاپی، پہاڑی، بینگنی، بھاتی (بھات لے جانے والا)، بھاری (بھار = بوجھ)، دھنی (دھن دولت والا)۔

اس سلسلے کا پہلا سوال شناخت کا ہے۔ اردو میں "ی" تین ہیں اور تینوں ہم شکل اور ہم معنی ہیں تو یہ کیسے معلوم ہو کہ کون سی "ی" کہاں اضافہ ہوئی اور اضافہ کے بعد جو مرکب وجود میں آیا وہ عربی، فارسی، ہندی ہے یا مخلوط النسل یعنی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر۔ مثلاً مذہبی، آتشی، اچاپتی وغیرہ۔ یہ الفاظ مذہب، آتش، اچاپت اور "ی" کی ترکیب سے بنے ہیں۔ پہلے یہ قواعد کے لحاظ سے اسم تھے۔ "ی" لاحق ہونے کے بعد اب یہ صفت کے صیغے ہیں۔ بظاہر ان کی "ی" میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر یہ کیسے کہا جاتا ہے کہ اول کی "ی" عربی ہے، دوسرے کی فارسی اور تیسرے کی ہندی۔

اصول یہ ہے کہ عربی لفظ کے آخر میں عربی کی "ی" فارسی لفظ کے آخر میں فارسی کی اور ہندی کے آخر میں ہندی کی۔ عموماً لفظوں کے بنانے اور مرکبات کے ڈھالنے میں یہ اصول برتا جاتا ہے لیکن یائے نسبت کا نسب وحسب دریافت کرنے کے لیے تنہا یہ اصول سامنے رکھنا کافی نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ دو باتیں اور بھی دیکھنی ہوں گی۔ اول یہ کہ کلمے کے آخر کی "ی" اہل اردو نے اضافہ کی یا پہلے سے چلی آرہی تھی۔ دوسرے یہ کہ "ی" اضافہ کرتے وقت زبان کے قواعد کا لحاظ رکھا گیا یا نہیں۔

دوسری بات کو پہلے لیجیے۔ عربی زبان میں جس اسم پر "ی" اضافہ کی جائے اور اس کے آخر میں "الف" "ی" یا "ہ" ہو تو یہ حروف "و" سے بدل جائیں گے۔ جیسے دہلی سے "دہلوی" امرؤ

سے امروہوی، بلیا سے بلیاوی، سودا سے سوداوی، اگر "ہ" ہو تو گر جائے گی۔ جیسے: فطرت سے فطری، طبیعت سے طبیعی۔ جن الفاظ کی وضع میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا ہے، عربی ہوں یا ہندی ان کے آخر کی "ی" عربی الاصل ہوگی۔ شہروں، برادریوں، خاندانوں کی طرف عموماً اسی اصول کے مطابق اہل اردو نسبت کرتے ہیں۔ ان تمام الفاظ کے آخر کی "ی" عربی شمار کی جائے اور ان کی اصل بتاتے وقت اس "ی" کو عربی سے ماخوذ بتایا جائے۔

اس کے مقابلے میں ان الفاظ کی "ی" جو عربی قاعدے کے خلاف وضع ہوئے ہندی ہوگی اور یہ سمجھا جائے گا کہ اردو والوں نے ان کے آخر میں "ی" بڑھا کر یہ صفتی الفاظ وضع کیے۔ جیسے فطرت سے فطرتی (وضع اور معنی دونوں لحاظ سے) اردو ہے۔

اب پہلی بات کو لیجیے۔ جن الفاظ و کلمات کی "ی" خواہ یہ کلمے عربی کے ہوں یا فارسی ہندی کے، اردو میں اضافہ نہیں ہوتی قدیم سے چلی آرہی ہے۔ یعنی اس زبان کی تھی جس زبان کا وہ لفظ ہے۔ اردو میں ان تمام الفاظ کی "ی" کو اس زبان سے ماخوذ بتایا جائے گا۔ ذیل کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

نہانی (پہلوی: نہانیک)، روانی (پہلوی: روبانیک)، آتشی (اتاشیک) تاری (فارسی تاریک)، دوزخی (پہلوی: دوشہوبک)

ان الفاظ کی "ی" پہلوی میں جو موجودہ فارسی کی قدیم شکل ہے) یا خود فارسی میں "یک" کی شکل میں تھی۔

بھاری (سنسکرت: بھارن)، پاپی (سنسکرت: پاپن)، تیلی (سنسکرت: تیلن)، دھنی (سنسکرت: دھنن)، مالی (سنسکرت: مالن)۔ ان الفاظ کی "ی" سنسکرت لاحقہ ِن کا تراشہ ہے۔ اردو فارسی کے ان الفاظ کی "ی" کو الفاظ سے الگ کرنا اور یہ کہنا کہ اردو والوں نے "ی" بڑھا کر یہ الفاظ وضع کیے درست نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فارسی یائے نسبت کی اصل لاحقہ ِک یا (ـِی ک) ہے اور اردو "ی" کی اصل لاحقہ ـِن، ـِک۔ یہ لاحقے قدیم فارسی اور سنسکرت میں اسمائے صفات بنانے کی غرض سے عموماً مستعمل تھے۔ آخر سے 'ک' یا 'ن' تخریب صوتی کی نذر ہوا اور اس کے عوض میں کسرے نے کھنچ کر 'ی' کی شکل اختیار کی۔ اس کے علاوہ اردو میں ایک 'ی' اور بھی ہے جو سنسکرت لاحقہ ـِی یا ـی سے تراشی گئی ہے۔ جیسے:

کھتری (بیں کشتری)، ابری (ابھری)، ہوتری (ہوتری)۔

اردو میں جو نسبتی یا صفاتی الفاظ مستعمل ہیں ان کی حسب ذیل پانچ شقیں ہیں۔

۱۔ خالص عربی الفاظ:

ظاہری، باطنی، علمی، فطری، جبلی، وہبی، کسبی، فقہی، تعبیراتی، منطقی، دہلوی، بریلوی، مولوی اس قسم کے الفاظ کا تجزیہ اس طرح کیا جائے گا۔ ظاہر + ی۔ باطن + ی۔

۲۔ خالص فارسی الفاظ:

نہانی، آتشی، تاری (سیاہ)، روانی (= روحانی)، اس قسم کے الفاظ کا تجزیہ ممکن نہیں۔ یہ بتانا پڑے گا کہ ان کی اصل کیا ہے جن سے یہ الفاظ کٹ چھٹ کر وجود میں آئے۔

۳۔ خالص پراکرتی الفاظ:

بھاری، تیلی، مالی، دھنی، پجاری، کھتری، ہوتری، پاپی۔ ان الفاظ کی بھی اصل بتانی ہوگی

۴۔ خالص اردو الفاظ:

اچاپتی، آڑھتی، ساڑھی، پہاڑی، مینگنی، جنگلی، ناگ پھنی، دھتی (دھت پگن)، گنگا جمنی، ٹکسالی۔ ان کے دونوں جز اردو ہیں اس لیے اس قسم کے کلمات کی اصل بتانے سے پہلے ان کا تجزیہ ہونا چاہیے۔ اس طور پر۔ اساڑھ + ی، اچاپت + ی، آڑھت + ی۔

۵۔ مخلوط اردو الفاظ۔ ان کی دو ضمنی قسمیں ہیں:

(الف) عربی اردو سے مخلوط:

فطرتی، حیبی، مطلبی، خیراتی، سودائی۔ یہ عربی الفاظ اور اردو یائے نسبت کی ترکیب کا نتیجہ ہیں۔

(ب) فارسی اردو سے مخلوط:

بادی (= ریاحی)، خونی (= قاتل)، ششماہی (= شش + ماہ + ی)، جامدانی (جامہ + دان + ی)، کامدانی، نوچندی (نو + چند + ی)، یہ فارسی الفاظ اور اردو یائے نسبت کی ترکیب سے وجود میں آئے۔ ان الفاظ کے اولین اجزا عربی و فارسی کے ہیں۔ اس لیے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کے آخری جز یعنی "ی" کو جو عربی میں بھی ہے اور فارسی میں بھی عربی یا فارسی قرار دے کر شق (الف) کے الفاظ کو خالص عربی اور شق (ب) کے الفاظ کو خالص فارسی کیوں نہ کہا جائے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ہر چند ان الفاظ کے اجزا اصل ماخذ کے لحاظ سے عربی اور فارسی کے ہیں لیکن "ی" لاحق ہونے کے بعد جو نئے صفاتی الفاظ وجود میں آئے وہ بناوٹ، استعمال نیز معنی کے لحاظ سے اردو میں معنی کے لحاظ سے اس لئے کہ فطرتی کے معنی ہیں عیار اور خونی کے معنی ہیں قاتل۔ عربی اور فارسی میں یہ الفاظ مستعمل نہیں اور اگر مستعمل ہیں تو ان کے یہ معنی نہیں۔ بناوٹ کے لحاظ سے بھی یہ عربی و فارسی کے لیے اجنبی ہیں۔ عرب "فطرتی" کو "فطری" کہے گا۔ اور ششماہی کے لیے فارسی کا ٹکسالی لفظ "ششماہہ" ہے۔

کچھ "ایسا" کے بارے میں

اردو قواعد کے بہت سے گوشے ہنوز تاریکی میں ہیں جنھیں جدید تحقیقات کے پیش نظر روشنی میں لانا زبان کی ترقی اور استواری کے لیے ضروری ہے۔ اس سے پہلے "ایسا" کے رفیق "جیسا" کی پیدائش سے لے کر جوانی تک کے ارتقائی منازل اور سوانح لکھ کر شایع کر چکا ہوں۔ اس کے آخر میں میں نے لکھا تھا کہ حضرات لکھنؤ "جیسا" کی جگہ اور معنوں میں "ایسا" استعمال کرتے ہیں۔ اس فرصت میں "ایسا" کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اس کا اولین محرک تو خود لفظ "جیسا" ہے۔ اسے شکایت ہے کہ اس کی تحقیق کا حق ادا نہیں ہوا۔ میں نے یہ لکھ کر :

"عہد اول کے اردو شعرا کے یہاں "جیسا" کے استعمال بطور لاحقہ تشبیہ مجھے نہیں ملا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں اٹھارہویں صدی کا نصف آخر اس کے ابھار یا پیداوار کا زمانہ ہے۔"

جمعہ جمعہ آٹھ دن اس کی عمر بتائی جس سے مشہور عالم اور ادیب مولانا عبد الماجد دریاآبادی کی اس رائے کو تقویت پہنچی کہ :

"میرے بچپن تک فصحا عموماً اس موقع پر "سا" یا "سی" ہی لاتے ہیں اور اس حد تک جوش صاحب کا خیال صحیح ہے۔ پھر بھی یہ : تھا کہ "جیسا" کا استعمال سرے سے معدوم ہو۔ آخر سبزواری صاحب نے اس دور سے بھی سندیں ڈھونڈ نکالی ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے درجے کے ادیبوں (خصوصاً اخبار نویسوں) نے "جیسا" اور "جیسی" کی بھرمار کر دی اور اس لیے صف اول کے بھی بعض ادیبوں کو متاثر ہونا ہی پڑا۔"[1]

اس میں شبہ نہیں کہ "سا" (جیسا کہ مولانا عبد الماجد نے ارشاد فرمایا) "جیسا" سے زیادہ

---

[1] اردو نامہ ۸ : ۷۷

قدیم ہے اور عموماً فصحائے دہلی و لکھنؤ کے یہاں استعمال ہوا ہے لیکن "ایسا" "جیسا" کا رفیق اور برابر کا ساتھی ہے۔ دونوں "سا" کی کوکھ سے پیدا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے ہمسر ہیں۔ شکایت اس امر کی ہے کہ جیسا کو بے دخل کر کے اس کے رفیق "ایسا" کو اس کی جگہ دے دی گئی اور حق دار کو محروم کر دیا گیا۔

یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ "جیسا" اور "ایسا" دونوں "سا" کی پیداوار ہیں۔ اول الذکر "جے" (جس) اور "سا" کی ترکیب سے بنا اور ثانی الذکر "اے" (اس) اور "سا" کی ترکیب سے۔ "سا" دونوں میں شریک ہے۔ "جیسا" کے اصلی معنی ہیں جس طرح اور "ایسا" کے معنی ہیں اس طرح۔ جب سے یہ الفاظ وضع ہوئے اپنے معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے ان کے اولین جز "جس" اور "اس" کے معنی فراموش ہوئے تو یہ دونوں لفظ "سا" کے معنوں میں اور اس کی جگہ استعمال ہونے لگے۔ "جیسا" کا دعویٰ ہے کہ وہ "سا" کا قدیم جانشین ہے۔ "سا" کی جگہ اول اول اسے ملی اور سب سے پہلے اس کی نیابت کا شرف اسے حاصل ہوا۔ بعد میں حضرات لکھنؤ نے "سا" کی نیابت کا شرف چھین کر اس کے رفیق "ایسا" کو بخش دیا۔ وہ "سا" کی جگہ "ایسا" استعمال کرتے اور اسے صحیح قرار دیتے ہیں اور "جیسا" کو "سا" کے معنوں میں سرے سے صحیح ہی نہیں سمجھتے۔

میرے خیال میں "جیسا" کی شکایت بے جا نہیں۔ صحیح معنوں میں وہ "سا" کا قدیم جانشین ہے۔ قدیم زمانے میں بھی "جیسا" "سا" کی جگہ مستعمل تھا۔ چنانچہ "سب رس" کے درج ذیل جملے میں اس کا محل استعمال وہی ہے جو "سا" کا ہے:

"ہمارا بادشاہ ایسا ہے ایسا ہے، جیسی تعریف کریں گے اس تعریف جیسا ہے۔"

(سب رس، ۲۷)

اول اول اس کے معنی موافق و مطابق ہوئے (جیسا کہ اس جملے میں ہے) اس کے بعد مثل اور مانند۔

سب رس ۱۶۳۴ء میں تصنیف ہوئی۔ سترہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں "سا" کی جگہ "جیسا" کا بے تکلف استعمال اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یہ لفظ سترہویں صدی سے پہلے "سا" کے موقع پر عام طور سے بولا جاتا اور "سا" کے معنوں میں اس کا استعمال صحیح و فصیح سمجھا جاتا تھا۔ انشا نے ۱۸۰۲ء کے لگ بھگ اس کے معنی متعین کیے اور اس کے استعمال کے قاعدے بتائے:

"جیسا۔۔۔ مثل "سا" حرف تشبیہ باشد یعنی مانند این کہ تیرے قد جیسا ایک بوٹا باغ

میں نہیں"۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جیسا (اور اس کے صیغے جیسی، جیسے وغیرہ) معنی اور استعمال دونوں لحاظ سے "سا" کی طرح ہے اور انشا کے زمانے میں ہر شخص (فصیح ہو کہ غیر فصیح دوسرے درجے کا ہو کہ صف اول کا) "سا" اور "سی" کے موقع پر "جیسا" اور "جیسی" استعمال کرتا تھا اور اس پر کسی کو اعتراض نہ تھا۔ انشا نے اس استعمال کی جو مثال پیش کی ہے اس میں "جیسا" (تیرے قد جیسا) ٹھیک اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح آج ہم بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔

اس سے پہلے انشا کا حسب ذیل شعر پیش کر چکا ہوں۔ اس میں "چاند جیسا" (چاند سا کی جگہ) استعمال ہوا ہے۔

اٹھتی کونپل اور چاہت بیگما کیا قہر ہے
چاند جیسا لگ گیا ہے ڈول یہ لکہ تجھے

اس شعر کی تاریخ بتانا مشکل ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انشا کے زمانے میں "جیسا" کا یہ استعمال عام تھا انشا کے علاوہ اس دور کے دوسرے فصحانے بھی اس موقع پر "سا" اور "سی" کے ساتھ ساتھ "جیسا" اور "جیسی" استعمال کیا اور اسے صحیح و فصیح سمجھا۔ اس کی تائید سعادت یار خاں رنگین جیسے زباں داں اور فصیح اللسان کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

گرچہ زناخی جیسی نہیلی نہیں ہوں میں
لیکن ازار بند کی ڈھیلی نہیں ہوں میں

اس کے بعد مسلسل اس کا استعمال ہوتا رہا۔ ذوق، ظفر، نذیر احمد، ناطق، کیفی کے منظوم و منثور کلام سے مثالیں اس سے پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ مولانا دریاآبادی فرماتے ہیں آج "جیسا" اور "سا" دونوں برابر برابر مستعمل ہیں۔ جیسا کا یہ استعمال سترہویں صدی سے آج تک چلا آرہا ہے۔

میں نے اس سے پہلے لکھا تھا کہ جیسا اسم کی مغیرہ حالت پر داخل ہوتا ہے اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ علامت اضافت کا/کی کی مدد سے اسم کے آخر میں لاحق کیا جاتا ہوگا۔ علامت اضافت تخفیف ہو گئی اسم کی محرف حالت آج تک برقرار ہے۔ سودا کے ایک قطعے میں جو کلیات سودا کے ایک مخطوطے (کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ) میں شامل ہے ذیل کا شعر ملا ہے۔ اس میں "کی جیسی" (علامت اضافت "کی" کے ساتھ) استعمال ہوا ہے۔

---

[1] دریائے لطافت، ص ۲۹۲

کیا کہوں میں کہ آج کیسی ہے   شکل شاہ جہاں کی جیسی ہے

اس سے میرے قیاس کی تائید ہوتی ہے:

بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ "سا" کے موقع پر جیسا آج فصحا کی زبان پر ہے۔ البتہ ایسا یا "کا ایسا" اس محل پر صرف اہلِ لکھنؤ کی زبان پر ہے یا ان اہلِ قلم کے یہاں ہے جو لکھنؤ کے مقلد ہیں۔ داغ کی طرح جنہیں لکھنؤ والوں کی خاطر عزیز ہے وہ کبھی کبھی استعمال کر جاتے ہیں۔ "ایسا" اصلاً متعلق فعل (Adverb) ہے۔ انشا لکھتے ہیں:

"و ایسا بمعنی چنیں"۔ یعنی "ایسا" کے معنی ہیں اس طرح۔ اور چونکہ یہ اصلاً متعلق فعل ہے اس لیے انشا نے "جیسا" کے قیاس پر اس کے دوسرے صیغے ایسی، ایسے وغیرہ نہیں لکھے۔ صرف ایسا لکھ کر چھوڑ دیا۔ انشا کی تحقیق ہے کہ "ایسا" کو صفت کے طور پر "اس جیسا" کے معنوں میں سب سے پہلے مغل پورہ والوں نے استعمال کیا۔ اس کے بعد یہ استعمال اردو میں عام ہو گیا۔

"اہل مغل پورہ 'ایسا' را 'اس سا'، و 'اس جیسا' گویند و ایں ہم صحیح و فصیح نزد اردو دانان بود"۔

اس عبارت سے دو چیزیں دریافت ہوئیں۔ اول یہ کہ 'ایسا' اردو میں متعلق فعل ہے اور فارسی چنیں کے معنوں میں ہے۔ دوسرے یہ کہ مغل پورہ کے رہنے والوں نے اسے صفت کے طور پر اس جیسا کے معنوں میں استعمال کیا اور اہل اردو نے اسے قبول کر لیا۔ انشا کے عہد تک "ایسا" کے صرف یہ دو استعمال تھے اور اہل اردو صرف ان دو معنوں میں اسے استعمال کرتے تھے۔ ان میں سے پہلا استعمال دوسرے سے زیادہ قدیم ہے۔ ان استعمالات کی دو چار مثالیں توضیح کی غرض سے درج کی جا رہی ہیں۔ ذیل کے شعر میں "ایسا" متعلق فعل ہے اور اس کے معنی ہیں اس طور پر اور اس طرح۔

چمن میں میں نہیں ایسا پھنسا کہ یوں چھوٹوں   مجھے تو ہر رگ گل تار دام ہے صیاد

"ایسے" اس کی جمع ہے:

فرہاد و قیس دسیر یہ آوارگانِ عشق   ایسے گئے ہیں سب کی رہی من کی من کے بیچ

اس استعمال کی قدیم مثال "سب رس" کا یہ جملہ ہے:

"ہمارا بادشاہ ایسا ہے ایسا ہے"۔

ذیل کی مثالوں میں ایسا، ایسی، ایسے صفت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی ہیں اس

طرح کا، اس قسم کا۔

اب جو ہاتھ آئے ہیں ہم مت مفت کھو ڈ یجو ہمیں   پھر نہ ہوگا تم کو ایسا کوئی پیدا آشنا

عشق کی تہمت جب ہوئی تھی کاہے کو ایسی شہرت تھی   شہر میں اب رسوا ہیں یعنی بدنامی سے کام کیا

دل کے تئیں اس راہ میں کھو افسوس کناں اب پھرتا ہوں
یعنی رفیق و شفیق پھر ایسے میر کہاں میں پاؤں گا

ان کے علاوہ "ایسا" کے دو استعمال اور بھی ہیں جن کا ذکر انشا نے نہیں کیا۔ ایک اسم کے طور پر مثل و مانند کے معنوں میں، جیسے:

"آسمان جو کسی جگہ سفید کوڑی یا کنول کے پھول کا ایسا ہے"[1]

"پھول کا ایسا" یعنی پھول کی طرح یا پھول کی مثل۔

دوسرے حرف (لاحقے) کے طور پر "سا" کی معنوں میں جیسے[2]:

بھرے آ میرے دل میں نور ایسا   کہ خاکستر یہ دل ہو طور ایسا

نور ایسا۔ نور سا طور ایسا۔ طور سا۔ اس کا قدیم استعمال فائز دکنی کی مثنوی رضوان شاہ و روح افزا (۱۰۹۴ھ - ۱۶۸۲ء) میں ملتا ہے۔

منج ایسا نرا سی کبھی اپچیا ہے کتیں   ندی کے کنارے سوں پیا ساہوں میں

اگرچہ اہل لکھنؤ آج "کا ایسا" اور "ایسا" دونوں یکساں طور سے استعمال کرتے ہیں لیکن میرا قیاس ہے کہ اول "ایسا" مثل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اس کے بعد "سا" اور "جیسا" کے قیاس پر حرف تشبیہہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اردو میں لفظوں کی تاریخ اور ان کے قواعدی ارتقا پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس لیے جب تک اچھا خاصا مواد نہ ہو محض اٹکل سے آخر کے ان دو استعمالوں کی صحیح اور قطعی تاریخ کی تعیین ذرا دشوار ہے۔ تاہم اس قدر وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب "دریائے لطافت" کی تصنیف کا ڈول ڈالا گیا "کا ایسا" اردو میں مستعمل نہ تھا اور اگر تھا تو فصیح نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انشا کی خاص ہندوستانی زبان کی ایک ناتمام مثنوی کا ذکر "معاصر" (پٹنہ) نے کیا ہے جس کا ایک شعر ہے:

بچھڑ جاتے تھے جو کبھی اک گھڑی   تو لگتی تھی ساون کی ایسی جھڑی

---

[1] مضامین شرر، ج ۱، حصہ ۲/ص ۲۰۵۔ [2] عشق نامہ نگار ص ۱

"معاصر"[1] کا بیان ہے کہ یہ مثنوی کلیاتِ انشا کے مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں نہیں۔ کلیات کے صرف دو قلمی نسخے ایسے ہیں جن میں اس مثنوی کے اشعار پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انشا نے "کی جیسی" استعمال کیا اور کاتب نے اپنے محاورے کے مطابق اسے "کی ایسی" بنا لیا۔

اگر یہ مثنوی انشا کی ہے اور انشا ہی نے "کی ایسی" لکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ "سا" اور "ایسا" دونوں اٹھارہویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے شروع میں عام طور سے "سا" کی معنوں میں استعمال ہوئے۔ اوپر کی سطروں میں "ایسا" کے استعمال کی مثال میں جو شعر درج ہوا وہ قادر علی نگار عظیم آبادی کی مثنوی عشق نامہ کا ہے جس کا سال تصنیف ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) ہے۔

بہرحال ایسا کے آخر کے دو استعمالات کا رواج پورب میں ہوا اور غالب خیال یہ ہے کہ ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک پورب میں یہ استعمال عام ہیں اور عالم و عامی سب "سا" کی جگہ "کا ایسا" یا "ایسا" لاتے ہیں۔ دہلی کے اہل قلم میں سے مولوی نذیر احمد نے شاید اہل لکھنؤ کی خاطر سے یا ان سے متاثر ہو کر جیسا کی جگہ ایسا استعمال کیا لیکن بہت کم اور ندرت کے ساتھ، مثلاً "رویائے صادقہ" کا جملہ ہے:

"اب تو ہندسہ اور ریاضی اور طبیعیات ایسے علوم کی قدر ہے"[2]

---

[1] معاصر حصہ اول ص ۵۹۔ [2] رویائے صادقہ ص ۱۸۴۔

لسانیاتی اصطلاحات

علمی اور فنی اصطلاحوں کا اردو میں ترجمہ کرنے سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہیے کہ اصطلاح کسے کہتے ہیں اور اس کے کیا معنی ہیں۔ تاکہ سب (All) بعض (Some)۔ دل چسپی (Interest) جیسے زبان کے عام الفاظ[1] جو روزانہ بات چیت میں برتے جاتے، ہر قسم کی تحریر و تصنیف میں جگہ پاتے اور ہر مقام پر ان کے وہی ایک معنی مراد لیے جاتے ہیں فرہنگ اصطلاحات میں شامل ہونے نہ پائیں۔ اصطلاح کے لفظی معنی ہیں اتفاق لیکن عرفِ عام میں وہ مصطلح یعنی متفق علیہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ہم اصطلاح اس لفظ کو کہتے ہیں جس کے کسی خاص علم و فن میں لغوی معنی سے الگ کوئی مناسب معنی یا عام اور متعدد معانی میں سے کوئی ایک معنی متعین کر لیے جائیں اور اس علم و فن کی متداول کتابوں میں وہ لفظ اپنے اس مخصوص معنی میں عام طور سے مستعمل ہو۔ مثلاً "حرف" کے معنی ہیں کنارہ۔ گرامر میں حرف ایک کلمہ ہے جس کے معنی مستقل نہ ہوں۔ "فقہ" کے معنی ہیں جاننا اور سمجھنا۔ دینیات میں فقہ علم دین یا شریعت کا جاننا ہے۔ لغت میں یہ لفظ عام تھا اصطلاح میں خاص کر لیا گیا۔

ہونٹ، دانت، تالو، مسوڑھا، حلق، حنجرہ وغیرہ الفاظ کو لسانیاتی اصطلاحات میں شمار نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ یہ زبان کے عام الفاظ ہیں۔ بول چال میں ان کے وہی معنی ہیں جو علم الاعضا و تشریح اجسام میں ہیں۔ "لہوی" ایک آواز ہے جو "لہاۃ" یعنی کوے کی مدد سے ادا ہوتی ہے۔ یہ اصطلاح ہے۔ خود "لہاۃ" کوئی اصطلاح نہیں۔ اسی طرح تکلیلی اصطلاح ہے تکلیل زبان کا عام لفظ ہے۔ تلفظ، کلمہ مجہورہ، مہموسہ، اصطلاحیں ہیں۔ ان کے لفظی معانی ان کے اصطلاحی

---

[1] ملاحظہ فرمایئے "فرہنگ اصطلاحات فلسفہ" شائع کردہ شعبۂ تالیف و ترجمہ کراچی یونی ورسٹی۔

معنوں سے مختلف ہیں، تقسیم، بامعنی، انحراف، ترمیم، تحریر، ترسیل، اولی، ثانوی، جنہ، عمل عام استعمال ہونے والے الفاظ ہیں[1]

مختلف علوم وفنون کی اصطلاحوں میں فرق کرنا ازبس ضروری ہے تاکہ ایک فن کی اصطلاحیں دوسرے فن کی اصطلاحوں میں گڈمڈ ہونے نہ پائیں۔ مثلاً تمثیل (Analogy) منطق کی اصطلاح ہے۔ قوس (Segment) اور اساس یا قاعدہ (Base) ریاضیات کی اور استعارہ (Mera-phor) علم بیان کی۔ انھیں لسانیات کی اصطلاح میں شامل ہونا نہ چاہیے۔ صوتیات، اشتقاقیات، معنویات، صرف، نحو، لسانیات کے اہم بنیادی شعبے ہیں۔ تحریر یا رسم خط کا بھی کچھ تعلق لسانیات سے ہے۔ ان علوم وفنون کی اصطلاحات کو فرہنگ اصطلاحات لسانیات میں جگہ دی جا سکتی ہے۔

اصطلاح کی تشریح وتعیین کے بعد ترجمہ کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ترجمہ میں کس زبان سے مدد لی جائے؟ کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ ترجمہ کے فاضل ارکان کی رائے ہے:

"اصطلاح سازی میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور ان تمام زبانوں سے مدد لی جائے جو ہماری زبان کا جز ہیں۔"

سنسکرت سے مدد لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ سنسکرت ہماری علمی زبان نہیں۔ ہم سنسکرت نہیں جانتے۔ ہماری زبان سنسکرت کے تہذیبی مزاج اور اس کی سرشت سے ناآشنا ہیں۔ سنسکرت کے ترجمے ہمارے یہاں رس بس نہیں سکیں گے۔ غیر منقسم ہندوستان میں اردو کی گذشتہ سات سو سال کی تاریخ میں سنسکرت کے علمی وتہذیبی الفاظ اردو کو سازگار نہ ہوئے تو پاکستان میں سنسکرت زبان کی علمی اصطلاحیں اردو میں جڑ پکڑ سکیں گی۔ فارسی سے البتہ مدد لی جا سکتی ہے لیکن فارسی برصغیر میں مسلمان کی تہذیبی زبان رہی ہے۔ علمی اصطلاحات کے بار کی شاید ہی وہ متحمل ہو۔ علمی زبان کے لیے جس نوع کی ثقاہت، سنجیدگی، متانت اور بھاری بھرکم پن درکار ہے وہ صرف عربی میں ہے۔ عربی دنیائے اسلام کی علمی زبان ہے۔ ہر خطے کے مسلمان نے اس سے استفادہ کیا اور اس کے علمی ذخیروں سے فیض اٹھایا۔ اردو برابر اپنی کم مایگی اور تہی دامنی کا علاج عربی الفاظ ومرکبات سے کرتی رہی ہے۔ اردو کے لیے عربی کی وہی حیثیت ہے جو انگریزی کے لیے لاطینی کی ہے۔ اردو میں عربی کے سوا کسی اور زبان کے اصطلاحی الفاظ کے رچنے بسنے اور گھل مل جانے کی گنجائش مجھے

---

[1] ملاحظہ فرمائیں "زبان اور علم زبان" کا ضمیمہ اصطلاحات۔ اس مقالے میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ تمام فرہنگ اصطلاحات فلسفہ اور ضمیمہ اصطلاحات سے ماخوذ ہیں۔

نظر نہیں آتی۔ دو ایک مثالیں پیش کرتا چلوں۔

language کا ترجمہ "زبان" خاصا بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن linguistic کا ترجمہ "زبانی" (بجائے لسانی) شاید ہی پسند کیا جائے۔ Dental کا ترجمہ "اسنانی" دندانی سے زیادہ ثقہ اور Lateral کا ترجمہ منحرف (= حرف یعنی پہلو کی طرف مائل) پہلوی سے زیادہ بامعنیٰ اور پروقار ہے۔

گردان، بولی وغیرہ فارسی ہندی ترجمے اردو میں رائج ہو چکے ہیں۔ یہ باقی رکھے جا سکتے ہیں۔ فارسی اردو کے رائج ترجموں کو چھوڑ کر باقی تمام اصطلاحات کے ترجمے عربی کی مدد سے ہونے چاہییں۔

اس سلسلے کا ایک اور رجحان جسے غیر منقسم ہندوستان میں برگ و بار لانے کا زیادہ موقع ملا، یہ ہے کہ عربی ہندی یا فارسی ہندی کے میل ملاپ سے اصطلاحیں وضع کر کے الفاظ و اصطلاحات کی گویا متحدہ قومیت کا ڈول ڈالا جائے۔ یہ رجحان علمی اور ادبی نقطۂ نگاہ سے مستحسن قرار دیا جا سکتا۔ لفظوں کو جوڑنے اور دو مختلف زبانوں کے الفاظ میں پیوند لگانے کے لیے ان میں صوتی مناسبت اور ایک طرح کی مزاجی ہم آہنگی ہونی چاہیے تاکہ مرکب الفاظ گھل مل کر ایک ہو جائیں اور نہ زبان پہ بار اور کانوں کو ناگوار نہ ہوں۔ انمل جوڑ بے جوڑ ہوں گے اور پنپنے نہ پائیں گے جیسے: اجنسیائی (ا + جنس + یا + ئی)، بانزدھرائی (باز + دھرا + ئی)، جھنکار اصوات (جھنکار + اصوات)، صوت تانت (صوت + تانت)، مورت نگاری (مورت + نگار + ی)، اہکاری (ا + ہکار + ی)۔

کراچی یونی ورسٹی کے ارکان شعبۂ ترجمہ و تالیف نے ایک طرف یہ تسلیم کر لیا ہے کہ "اصطلاح زبان اور فن کے لحاظ سے موزوں ہو۔" دوسری طرف فرماتے ہیں:

"ضرورت ہو تو ہندی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی کا جوڑ اور سابقے لاحقے لگائے جائیں۔"

سوال یہ ہے کہ "ہندی الفاظ کے ساتھ عربی جوڑ" کے بعد کیا کوئی اصطلاح زبان کے لحاظ سے موزوں ہو سکتی ہے؟"

انسان کی طرح زبان کا بھی مزاج ہوتا ہے جس کا وضع اصطلاحات کے وقت بہر حال خیال رکھنا چاہیے۔ عام بول چال کے الفاظ پر تو کسی کا اجارہ نہیں۔ جو لفظ عوام کی ٹکسال سے چل

نکلا وہ رائج الوقت سکہ ہے۔ اصطلاح سازی البتہ اہلِ علم کا کام ہے۔ یہ ان کے اختیار میں ہے کہ وہ زبان کے مزاج و منہاج کی مناسبت سے اصطلاحیں وضع کریں۔ اصطلاح میں جو عظمت اور ایک طرح کی گمبھیرتا ہوتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اصطلاحی الفاظ صوتی لحاظ سے موزوں، قواعدِ زبان کے مطابق، بناوٹ میں بھاری بھرکم اور دلالتِ معنی کی رو سے مناسب ہوں۔ ہر چند فارسی الفاظ کے آخر میں نسبت کی "ی" لاحق کر کے ہزاری، بزاری جیسے الفاظ عام طور سے اردو میں وضع کیے جاتے رہے ہیں لیکن مستند علمی زبان میں فارسی الفاظ پر یائے نسبت کا اضافہ ثقاہت کے خلاف ہے جیسے خردی (خرد + ی)، پہلوئی (پہلو + ئی)، لبی (لب + ی)، دولبی (دو + لب + ی) وغیرہ۔ اور ان وضع کردہ الفاظ پر عربی کی "ۃ" داخل کرنا یا ٹھیٹ ہندی الفاظ پر "ی" بڑھانا ایسا ہے جیسے کریلا اور نیم چڑھا۔ مثلاً جوڑا جوڑی (جوڑا + جوڑ + ی)، تالوی (تالو + ی)، دانت بیٹھکی (دانت + بیٹھک + ی)، تالویہ (تالو + ی + ہ)، خردیت (خرد + ی + ۃ)۔

عربی سے لی جائے یا فارسی سے، اصطلاح کو کم سے کم زبان کے صرفی نحوی قاعدوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ لہاۃ (= کوا)، عمق (= گہرائی)، معنی (= مفہوم) عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ عربی گرامر کے مطابق "لہاۃ" سے "لہوی" بنتا ہے لہاتی غلط ہے۔ عمق سے عمقیت (عمق + ی + ۃ) تو ہو سکتا ہے عمقت درست نہیں۔ "معنی" کی طرف نسبت کی جائے تو معنوی بنے گا اور اس پر "ات" بڑھا کر معنویات (Semantics) کہیں گے۔ "معنیاتی" (معنی + ات + ی) یعنی بہت سے معنی والا بے محل بھی ہے اور بے معنی بھی اس لیے کہ بہت سے معنی والا کوئی فن نہیں معنی سے متعلق بہت سے مسائل والا فن ہے۔ حد کبریٰ اور حد صغریٰ قواعدِ نحو کے اعتبار سے غلط ہے۔ حد اکبر اور حد اصغر چاہیے۔ "فنون صغیر" کی جگہ "فنون صغیرہ" صحیح ہے۔

اصطلاحات عموماً مفرد ہوتی ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو مفرد اصطلاح کا ترجمہ مفرد لفظ سے کیا جائے۔ مرکب اصطلاحیں بھی ہیں لیکن کم۔ یہ دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جنھیں آسانی کے ساتھ ایک لفظ میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ انھیں ایک سے زیادہ لفظوں میں منتقل کرنا درست نہیں۔ خصوصیت سے اس صورت میں جب ان کے ہم معنی مفرد اصطلاحیں پہلے سے رائج ہوں، جیسے: major premise اور minor premise یا major term اور minor term بالا کے اصطلاحوں کا ترجمہ مقدمہ کبری اور مقدمہ صغری کی جگہ صرف کبری صغری اور بعد کی اصطلاحوں کا اکبر (بجائے حد اکبر)، اصغر (بجائے حد اصغر) ہونا چاہیے۔ جن اصحاب نے عربی زبان میں منطق پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ منطق کی متداول کتابوں میں صغریٰ کبریٰ اصغر اور اکبر

وغیرہ اصطلاحیں عام طور سے استعمال ہوتی ہیں۔ حدِ اوسط کو البتہ تنہا اوسط نہیں کہتے اس لیے Middle term کا ترجمہ حدِ اوسط ہو سکتا ہے۔ کچھ مرکب اصطلاحیں ایسی بھی ہیں جنھیں ایک لفظ میں بآسانی منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے: Agent Nour، Vocal Chords، Phonetic Decay وغیرہ۔ انھیں مناسب مرکبات کی شکل میں منتقل کیا جائے۔

ان کے علاوہ جن مرکبات کو اصطلاح کی حیثیت حاصل نہیں ان کے اجزا کا اولاً الگ الگ ترجمہ کرنا اور پھر جوڑ کر بصورت ترکیب اردو میں منتقل کرنا طول لاطائل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مفردات یعنی اجزا کا ترجمہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد قاری کی ذہانت پر اعتماد ہو کہ جب اس کے سامنے دو لفظوں کا کوئی جوڑ آئے تو حسب ضرورت زبان کے مقررہ قاعدوں کے مطابق اسی قسم کا ایک مرکب ڈھال لے۔ مثلاً Law اور Polarity کا ترجمہ اگر قاری کو معلوم ہے تو Law of Polarity کے ترجمے کی ضرورت نہیں۔ Phonetic کے معنی بتا دیے جائیں تو Phonetic Change کا مطلب نکالا جا سکتا ہے۔ Metaphysics، Dedution اپنی اپنی جگہ واضح ہوں تو اس کی ضرورت نہیں کہ Meta-physical Deduction کا ترجمہ بتایا جائے یا Deduction اور Category کے ترجمے کے بعد Deduction of Category کا ترجمہ درج کر کے ہندی کی چندی کی جائے۔ یہ تطویل لاطائل ہی نہیں تحصیل لاحاصل بھی ہے۔

فرہنگ اصطلاحات میں ورنر کا قانون، گرم کا قانون، گراس مین کا قانون، قانون ہابر، جالینوسی شکل جیسی ترکیبیں نظر پڑتی ہیں تو حیرت دل کے دامن کو کھینچتی ہے کہ خدایا یہ کس قسم کے ترجمے اور ان کا اصطلاح سازی سے کیا تعلق ہے۔ قانون اور شکل کا ترجمہ کرنے کے بعد یہ کیا ضروری تھا کہ ورنر، گرم، گراس مین، ہابر اور جالینوس وغیرہ علمائے فن کے ناموں کی طرف اضافت کر کے بتایا جاتا کہ اس طرح مرکبات بناؤ۔

غیر ضروری مرکبات کے ترجموں کی کچھ اور مثالیں فرہنگ اصطلاحات فلسفہ و لسانیات سے انتخاب کر کے لکھی جا رہی ہیں۔

فلسفۂ لغت، فلسفۂ قانون، لغت سائنس، منطقی تجربیت، معروضی اخلاقیات، آلاتی قدر، ماورائی تصوریت، ماورائی طریقہ، ماورائی فلسفہ، ماورائی ثبوت، منطقی نحو، ترکیبی حکم، تجربی صوتیات، صوتی جدول، کلام کا بہاؤ، گولایا ہوا مصوتہ، بند مصوتہ، کھلا مصوتہ، مصوتہ کی تجدید، مصوتہ کی ہم آہنگی، وسطی مصوتہ، ہم عملی مرکب، جوڑا جوڑی مرکب، تاریخی لسانیات، تقابلی لسانیات، موسیقانہ (موسیقیانہ) لہجہ۔

یہ درست ہے کہ فن کی جو اصطلاحیں قدیم سے چلی آ رہی ہیں انھیں برقرار رکھا جائے لیکن ان موزوں ناموزوں اور مفید و غیر مفید کی تفریق مناسب نہیں۔ قدیم سے جو اصطلاحیں چلی آ رہی ہیں فن کی کتابوں میں عموماً برتی جاتی ہیں، اور زبان میں اچھی طرح رس بس گئی ہیں۔ وہ موزوں ہی نہیں مفید بھی ہیں۔ زبان میں گھل مل گئی ہیں اس لیے موزوں

ہیں۔ ہر شخص آسانی کے ساتھ ان کا مطلب سمجھ لیتا ہے اس لیے مفید ہیں اور موزونیت یا افادیت کا معیار یہ ہے کہ اصطلاح زبان میں گھل مل کر اس کا جزو بن جائے اور اس کا مفہوم سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت پیش نہ آئے مثلاً Nasal کا ترجمہ 'غنہ' اردو میں عام ہے اور ہر شخص اسے جانتا پہچانتا ہے 'انفی' کے مقابلے میں یہ موزوں بھی ہے اور مفید بھی Nasalised کو مغنونہ کہیں گے 'انفیاتی' نامانوس ہے Lateral 'منحرف' کا ترجمہ ہے اس کو چھوڑ کر 'پہلوی' ایک نیا لفظ گھڑنے کی کیا ضرورت ہے جس کی افادیت اور موزونیت دونوں مشکوک ہیں۔

یہاں سے اصول یہ دریافت ہوا کہ اصطلاحات کا ہماری زبان میں کوئی قدیم ترجمہ موجود نہ ہو تو نیا لفظ وضع کیا جائے۔ وضع اصطلاح میں عموماً لغوی معنی کو سامنے رکھ کر اس کا لفظی ترجمہ کر دیا جاتا ہے جیسے Cerebral (مخی)، Lateral (پہلوی) aspirates (بہ نفسی) voiced (صمیت) وغیرہ۔ یہ درست نہیں۔ لغوی معنی کی جگہ اصطلاحی معنی کو پیش نظر رکھ کر ایسا لفظ وضع کرنا چاہیے جو اصطلاحی مفہوم کو واضح کر دے اور اتنا روشن ہو کر مزید تشریح و تعریف کی ضرورت پیش نہ آئے۔ ترجمے کا مقصد اصطلاح کی توضیح ہے جو اصطلاح کے لغوی مفہوم کی رعایت اور اس کے پابند لفظی ترجمے سے نہیں اصطلاحی مفہوم کو اردو میں منتقل کرنے سے حاصل ہوتی ہے مثلاً مخی (= دماغی) سے ہمیں کوئی روشنی نہیں ملتی۔ اس کے مقابلے میں ملفوفی (= لپٹے ہوئے) سے پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ آوازیں ہیں جن کو ادا کرتے وقت زبان اچٹ جاتی اور لپٹ کر دوہری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح "منحرف" وہ آواز ہے (ل) کہ بوقت تلفظ زبان کے کناروں سے ہوا سرک کر نکل جائے Voiced ترجمہ صمیت (= آواز دینے والا) اور مسموع (= سنا ہوا) کیا گیا ہے۔ مجہورہ ان سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ ان آوازوں میں ایک طرح کی جھنکار ہوتی ہے۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مجہور (= جہر اور جھنکار والا) سے بہتر لفظ ہماری زبان میں نہیں۔ اس کے مقابلے کی آوازیں کمزور اور دھیمی ہوتی ہیں۔ انگریزی میں انھیں (Unvoiced) کہتے ہیں۔ اہل اردو نے اس کا ترجمہ غیر صمیت (= جس کی آواز نہ ہو) کیا۔ یہ اصطلاح اور اس کا ترجمہ دونوں غیر واضح ہیں۔ ان سے آوازوں کی حقیقت بے نقاب نہیں ہوتی۔ میں نے مہموسہ (= دھیمی آواز والے) تجویز کیا ہے جو ان آوازوں کی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ سنسکرت میں مجہورہ کو گھوش وت (= جھنکار والا) اور مہموسہ کو اگھوش وت کہتے ہیں۔

بہرحال اصطلاح کا اردو ترجمہ واضح موزوں اور مناسب یعنی اصطلاحی مفہوم کو بے نقاب کرنے والا ہونا چاہیے۔ میں نے اصطلاحات کے ترجموں میں تابمقدور ان تمام اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ جہاں تک ہو سکا میں نے اصطلاحات کی شرح اور ان کے لفظی معنوں کی وضاحت بھی کر دی ہے اور بعض اصطلاحوں کے سنسکرت متبادل یا مترادف الفاظ لکھ دیے ہیں تاکہ اردو اصطلاحوں کو سمجھنے اور ان کی لفظی و اصطلاحی حقیقت کی دریافت میں یہ معاون ہوں۔

فرہنگ اصطلاحات

Ablative	... منی (حالت)	من = سے
Ablaut	... تعلیل مجہول	ردوبدل جس کی وجہ معلوم نہ ہو
Absolutive	... حالیہ	کردنت
Accent	... نقرہ	نقرہ = ضرب
Accoustic	سمعی	
Accusative	... مفعولی (حالت)	کرم
Active	معروف (طور)	
Adessive (case)	مفعول معہ	
Adjective	صفت	
Adverb	متعلق فعل	
Affix	اضافہ	
Affricates	دتفیہ جاریہ	
Agent	فاعل	کرتا = کرنے والا
—Noun	اسم فاعل	
Aggiutinative	اتصالی	
Aggregative (Compound)	عطفی (مرکب)	دوند (سماس)
Aliophone	ہم صوت	
Alphabets	ابتث - ابجد	ورن مالا
Alucolar	... لثوی	لثہ (مسوڑھا) کی طرف منسوب
Analytical	تحلیلی	
Anaptyxis	... تسہیل	سور بھکتی، مخلوط کو حرکت دے کر حروف کو الگ کرنا

Antithesis	تقابل	
Aorist	ماضی مطلق	
Apocope	ترخیم	
Article (definite)	آلۂ تعریف	
—(indefinite)	آلۂ تنکیر	
Articulation	ادا	
Articulor	... مخرج	کرن، استھان
Aspirates	... ہائیہ	مہاپران
Assimilation	تجنیس۔ ادغام	
Audition	سماع	
Augens	حرفِ تاَ ر	
Augment	... اضافیہ	اُپ سرگ
Auxiliary	معاون (فعل)	
Back formation	متاخر اشتقاق	
Bilabial	... شفوی	شفہ (ہونٹ) سے ادا ہونے والا
Bi-partite	... ذوجزئین	دو جز والا
Case	... حالت (اعرابی)	کارک
Causative	متعدی المتعدی	
Cerebral	... لسان حنکی	موردھنیہ
Close	... مسدود	سم ورت
Cognate	قریب۔ متجانس	
Compound	... مرکب	سماس
Conjugation	گردان	
Conjunet	... مخلوط	سنیکت
Conjunction	عاطفہ	
Consonant	مصمت۔ صحیح	دینجن
Dative	مفعولی ثانوی (حالت)	سمپردان
Declension	انصراف	
Deformation	بگاڑ	

English	Urdu	Other
Degree	تفضیل	
Denominative	وضعی (فعل)	
Dental	...اسنانی	دنتی
Derivation	اخذ۔ اشتقاق	
Dialect	بولی	
Diminutive	مصغر (اسم)	
Diphthong	مرکب (مصوتہ)	
Dual	تثنیہ	
Elliptical	اختزای (مرکب)	
Elision	حذف	
Ending	اختتامیہ	
Epenthesis	درج	
Etymology	علم الاشتقاق	
Etymen	ماخذ	
Euphemisn	کنایہ	
Explosive (Mutes, stop) plosive	...وقفیہ	سپرش
Extension	الحاق	
Finite (Verb)	حقیقی	
Flapped	تکریری	
Fricative	...جاریہ	اُوشمن
Formative	تعمیری	
Feminine	مونث	استری لنگ
Future	...مستقبل	بھوشیہ
Gender	...جنس	لنگ
Genealogical	نسلی	
Genitive	اضافی (حالت)	
Gerund	اسم مصدر	
Guttural	حلقوی	
Glottal	...حلقی	کنٹھی

Hyplology	تخفیف	
Hiatus	اجتماع	
Homophone	متشابہ الصوت مشترک	
Illative (case)	... مفعول الیہ	انتہا اور حد بتانے والا
Imperfect	ناتمام	
Imperative	امر	
Implosive	... موقوف	جدید صوتیات کی اصطلاح
Infinitive	مصدر	
Infix	... دارجہ	وسط کلمے میں اضافہ
Infiextion	تصریف	ہونے والا
Inflexional	تصریفی	
Instrumental	آلی (حالت)	
Interdental	بین اسنانی	
Interjection	ندائیہ (حرف)	
Interrogative	استفہامیہ (جملہ)	
Intonation	ایقاع	
Intrusion	دخول	
Isolative	انفرادی	
Juxtapositional	ارتباطی	
Kymography	صوت نگاری	
Labral	شفوی	شفہ = ہونٹ (اوشٹھ)
Laryngal	حنجری	
Lateral	منحرف	
Linguas	لسانی	
Linguistics	لسانیات	
Liquid (Trilled)	مکررہ	
Locative	ظرفی (حالت)	
Loan (Word)	دخیل	
Long (V· wel)	... طویل۔ ممدود	دیرگھ

Masculine	... مذکر	مُیننگ
Metathesis	قلب	
Mediae { Sonant / Voiced }	مجہورہ	
Melioration	معنوی ارتقا	
Monosyllabic	یک رکنی ۔ احادی المقطع	
Mood	صورت	
Morpheme	صیغہ	
Morphology	علم الصرف	
Mutation	ابدال	
Mutes (Stops)	وقفیہ	
Nasal	غنہ	ناسکی ۔ انزناسک
Nasalised	مغنونہ	
Negative	منفی	
Neutral	بے جنس	
Nominative	فاعلی (حالت)	
Noun	اسم	
Number	عدد	
Oblique	محرف ۔ مغیرہ (حالت)	
Onomatopoeic	... حکائی	کسی آواز کی نقل میں وضع کردہ
Open (Vowel)	... مُنفتحہ	وورت
Optative	دعائیہ (جملہ)	
Orthography	علم التحریر	
Palatal	... حنکی	حنک (= تالو) + ی (نسبت)
Palatogram	مخرج نگار (آلہ)	
Participle	حالیہ	
Particle	حرف	
Passive	مجہول (طور)	
Past	ماضی	

Pause	وقفہ	
Pejoration	تنقیص	
Perfect	تمام	
Person	فاعل	
Pharyngal	...اتصا حلقی	اتصا = پچھلا
Philology	فیلالوجیا۔ علم اللسان	
Phoneme	صوتیہ	
Phonemics	علم صوتیہ	
Phonation	صدا	
Phonetic	صوتی	
—Decay	تحت۔ تخریب صوتی	
Phonetics	صوتیات	
Phonology	علم صوت	
Phrase	فقرہ	
Portmanteau-word	وہ مرکب جس کے اجزا کا کچھ حصہ ساقط ہو جائے ... اختزامی (مرکب)	
Possess (Genitve)	اضافی حالت	
Post-position	... صلہ	فعل کو اسم سے ملانے والا
Plosive (Stop)	وقفیہ	
Prefix	سابقہ	
Preposition	صلہ	
Present	حاضر، حال	
Primitive	قدیم	
Pronominal	مبہماتی	
Pronunciation	تلفظ	
Proto form	ما قبل۔ اصلی	
Punctuations	رموز اوقات	
Radical	بنیادی	
Reduplicated	تکریری	
Retroflex	ملفوف	

Rolled (Trilled)	... مکررہ	(ر، ل)
Root	مادہ	
Rounded	مدور	
Semantic, Semasiology	معنویات	
Semology	علم المعانی	
Semi-vowels	نیم مصوتہ، لینہ	(ی، و) انفسحہ
Short (Vowel)	قصیرہ، مقصور	ا، ر، ہ
Sibilant	صفیریہ	
Sonants (Voiced)	مجہورہ	
Sounds	اصوات	
Specialisation	تخصیص	
Spirants	... ہوائیہ، صفیریہ	(ح خ ع غ ث، ذ، ف، و)
Stem	مشتق منہ	
Stops	وقفیہ	
Substantive	اسم	
Suffix	لاحقہ	
Surd (unvoiced)	مہموسہ	
Syllable	مقطع، رکن	
Syntagm	ترکیب	
Syntax	نحو	
Tense	گردان	
Tenuis (unvoiced)	مہموسہ	
Terminational	اختتامی	
Tone	لہجہ	
Trilled (Rolled)	... مکررہ	(ر، ل)
Tatsama	دخیل	
Tadbhawa	مولد	
Umlaut	تعلیل معروف	ردوبدل جس کی وجہ بتائی جاسکے

Unaspirated	غیر ہائیہ	
Unvoiced	مہموس	
Uvular	لہوی	
Variant	لغت	
Variation	تغیر	
Velar	"جھوا مولیا" تالو کے نرم حصے سے ... غشائی ادا ہونے والے (ص، ط، ض، ظ)	
Velarised	مطبق	
Verb	فعل	
Vocal	صوتی	
—Cords	سلک صوتی	
Vocalic	مصوتی	
Vocative	ندائیہ	
Voice	طور	
Voiced	... مجہورہ	گھوش وت
Vowel	... مصوتہ	سور
Word	... کلمہ	اکشر

اہم مطبوعات

ناول اور افسانے

داراشکوہ (ناول) قاضی عبدالستار ۳۵/-
حضرت جان (ناول) 〃 ۶۰/-
خالد بن ولید (ناول) 〃 ۳۰/-
صلاح الدین ایوبی (ناول) 〃 ۳۰/-
شب گزیدہ (ناول) 〃 ۳۰/-
غالب (ناول) 〃 ۳۰/-
چار ناولٹ (ناولٹ) قرۃ العین حیدر ۵۰/-
روشنی کی رفتار (افسانے) 〃 ۵۰/-
آخر شب کے ہمسفر (ناول) 〃 ۴۵/-
نیلمبر (افسانے) حمیدہ سلطان ۲۰/-
آنگن (ناول) خدیجہ مستور ۳۰/-
خدا کی بستی (ناول) شوکت صدیقی ۴۵/-
چوٹیں (افسانے) عصمت چغتائی ۲۰/-
ضدی (ناولٹ) 〃 ۱۲/-
انتظار حسین اور انکے افسانے مرتبہ: گوپی چند نارنگ ۳۰/-
کرشن چندر اور انکے افسانے مرتبہ: اطہر پرویز ۳۰/-
راجندر سنگھ بیدی اور انکے افسانے 〃 ۳۵/-
اردو کے تیرہ افسانے 〃 ۳۰/-
ہمارے پسندیدہ افسانے 〃 ۲۰/-
منٹو کے نمائندہ افسانے 〃 ۱۵/-
پریم چند کے نمائندہ افسانے مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس ۱۶/-
نمائندہ مختصر افسانے مرتبہ: محمد طاہر فاروقی ۹/-

سرسید

سرسید ایک تعارف پروفیسر خلیق احمد نظامی ۳/-
انتخاب مضامین سرسید آل احمد سرور ۸/-
سرسید اور انکے نامور رفقاء سید عبداللہ ۳/-
مطالعہ سرسید احمد خاں عبدالحق ۲/-

لسانیات و جمالیات

مقدمہ تاریخ زبان اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۲۵/-
اردو زبان و ادب 〃 ۳/۵۰
اردو لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۵/-
اردو میں لسانی تشکیل مرزا خلیل بیگ ۴۰/-
لسانیات کے بنیادی اصول اقتدار حسین خاں ۴۰/-
جمالیات شرق و غرب پروفیسر ثریا حسین ۲۰/-
ادب میں جمالیاتی اقدار ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۱۰/-

مثنوی

اردو مثنوی کا ارتقاء عبدالقادر سروری ۱۵/-
اردو کی تین مثنویاں خان رشید ۱۶/-
انتخاب مثنویات اردو معین الدین قریشی ۶/-
مثنوی گلزار نسیم مقدمہ: ظہیر احمد صدیقی ۱۰/-
مثنوی سحرالبیان 〃 ۱۲/-

اقبالیات

کلیات اقبال اردو صدی ایڈیشن ۳۵/-
اقبال معاصرین کی نظر میں وقار عظیم ۵۰/-
اقبال بحیثیت شاعر رفیع الدین ہاشمی ۴۵/-
اقبال کی اردو نثر عبادت بریلوی ۲۰/-
اقبال شاعر اور فلسفی وقار عظیم ۲۰/-
فکر اقبال خلیفہ عبدالحکیم ۵۰/-
شکوہ جواب شکوہ (مع شرح) علامہ اقبال ۳/-
بانگ درا عکسی 〃 ۳۰/-
بال جبریل 〃 〃 ۱۵/-
ضرب کلیم 〃 〃 ۱۵/-
ارمغان حجاز اردو 〃 〃 ۳/۵۰

غالبیات

غالب: شخص اور شاعر مجنوں گورکھپوری ۱۵/-
دیوان غالب مقدمہ: نورالحسن نقوی ۲۰/-

فیض

کلام فیض عکسی فیض احمد فیض ۲۵/-
نقش فریادی 〃 〃 ۶/-
دست صبا 〃 〃 ۶/-
زنداں نامہ 〃 〃 ۶/۵۰
دست تہ سنگ 〃 ۹/-

ادب و تنقید

اسلوبیاتی مطالعے منظر عباس نقوی ۵۰/-
نقد مسعود مرزا خلیل احمد بیگ ۱۵/-
جدید اردو نظم نظریہ و عمل عقیل احمد ۵۰/-
اردو صحافت کی تاریخ نادر علی خاں ۸۰/-
ادب، ادیب اور اصناف محمد امین ۳۰/-
دکنی ادب کی تاریخ محی الدین قادری زور ۱۲/-
اردو قصیدہ نگاری ام ہانی اشرف ۲۰/-
پریم چند ایک نقیب ڈاکٹر صغیر افراہیم ۳۰/-
ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمن اعظمی ۳۵/-
دیوان غالب مع شرح ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی ۵۰/-
آیئے اردو سیکھیں ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ ۱۰/-
اردو کیسے پڑھائیں! سلیم عبداللہ ۱۲/-
اردو ادب کی تاریخ عظیم الحق جنیدی ۱۵/-
اردو ناول کی تاریخ و تنقید علی عباس حسینی ۲۵/-
اردو ڈراما تاریخ و تنقید عشرت رحمانی ۳۰/-
احساس و ادراک ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۲۲/-
انیس شناسی ڈاکٹر افضل امام ۱۶/-
چہرہ بہ چہرہ ڈاکٹر امین فرید ۲۵/-
اردو ادب میں طنز و مزاح وزیر آغا ۴۰/-
غزل کا نیا منظر نامہ شمیم حنفی ۱۰/-
غزل کی سرگزشت اختر انصاری ۱۲/-
آج کا اردو ادب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۲۵/-
جدید شاعری ڈاکٹر عبادت بریلوی ۳۰/-
غزل اور مطالعہ غزل 〃 ۳۰/-
اردو تنقید کا ارتقا 〃 ۳۵/-
داستان سے افسانے تک وقار عظیم ۲۵/-
نیا افسانہ 〃 ۲۵/-
موازنۂ انیس و دبیر مقدمہ: ڈاکٹر افضل امام ۱۵/-
مقدمۂ شعر و شاعری مقدمہ: ڈاکٹر وحید قریشی ۱۵/-
امراؤ جان ادا مقدمہ: تمکین کاظمی ۱۶/-
انار کلی مقدمہ: ڈاکٹر محمد حسن ۱۰/-
مجموعہ نظم حالی مقدمہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۶/۵۰

سیاسیات و تاریخ

اصول سیاسیات محمد اعظم قاسمی ۴/-
دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) 〃 ۴/-
تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پولیٹیکل تھاٹ) 〃 ۲۰/-
جمہوریۂ ہند کا کانسٹی ٹیوشن (آف انڈیا) 〃 ۴/-
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) 〃 ۱۹/-
مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس) 〃 ۶/۵۰
اسلامی تاریخ اے اے ہاشمی ۱۰/-

متفرق

ایڈوانسڈ اکاؤنٹس ڈاکٹر محمد عارف ظل ۱۵/-
جدید تعلیمی مسائل ڈاکٹر ضیاء الدین علوی ۲۰/-
اصول تعلیم 〃 ۲۰/-
سماج کا بنیادی تصور ؟ ونظریہ 〃 ۱۲/-
جدید علم سائنس وزارت حسین ۱۵/-
گلدستۂ مضامین انشا پردازی ڈاکٹر محمد عمار خاں ۱۲/-
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے مسرت زمانی ۲۰/-
رہبر تندرستی 〃 ۱۵/-
علم خانہ داری 〃 ۲۰/-
بچوں کی تربیت 〃 ۱۵/-
اردو صرف ڈاکٹر انصار اللہ ۶/-
اردو نحو 〃 ۵/-
فیروز اللغات جیبی عکسی ۱۵/-
اردو شگفتہ / ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے ۳/-
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر / ایم۔ اے۔ شبیہ ۱۲/-

ایجوکیشنل بک ہاؤس • مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲